خرابی کہاں ہے

علامہ یوسف القرضاوی

مرکزی
مکتبہ اسلامی
دہلی

خرابی کہاں ہے؟

مصنف

علامہ یوسف القرضاوی

مترجم

ابو مسعود اظہر ندوی

مرکزی مکتبہ اسلامی۔ دہلی

سلسلہ مطبوعات اشاعت اسلام ٹرسٹ - ۱۱۳۶

نام کتاب	خرابی کہاں ہے؟
مصنّف	علّامہ یوسف القرضاوی
مترجم	مولانا ابو مسعود اظہر ندوی
صفحات	۹۶
کمپوزنگ	افکار کمپوزرز - ۲۲/۱۵۳، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵
ناشر	مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۳۵۳، چتلی قبر، دہلی ۶
اشاعت :	
طبع اوّل	جون ۱۹۹۶ء ۲۰۰۰

قیمت : ۲۰/= روپے

KHARABI KAHAN HAI? (Urdu)
By Yusuf Al Qarzavi
Translated by Abu Masood Azhar Nadvi
Price Rs. 20.00

مطبوعہ :
دعوت آفسٹ پرنٹرز، دہلی ۶

فہرست

حرفِ چند	۵
پہلا باب : خرابی کہاں ہے؟	**۷**
خود فراموشی	۸
مادی ترقی کے معیار سے	۱۰
ذہنی صلاحیت	۱۱
عملی تعطل	۱۳
اقتصادی صلاحیت	۱۶
افرادی قوت	۱۸
روحانی صلاحیت	۲۰
ذمے دار کون؟	۲۴
علماء کی ذمے داری	۲۶
عوام کی ذمے داری	۲۷
اسلامی تحریکوں کی ذمے داری	۲۸
دوسرا باب : اسلامی تحریکیں	**۲۹**
ذمے داری کی حد	۳۱
خود احتسابی کی کمی	۳۴
اختلاف اور پھوٹ	۳۹

عقلی و عملی رجحان پر جذباتی رجحان کا غلبہ ۴۶
مطالعہ و منصوبہ بندی میں کوتاہی ۴۸
جلد بازی ۵۲
مبالغہ آرائی ۵۸
تجدید پسندی سے خوف ۶۳

تیسرا باب : امیدیں اور کام ۶۹
اسلامی تحریکوں سے انصاف کیجیے ۶۹
کام کا ماحول ۷۰
تحریکیں برقرار رہیں ۷۱
کارنامے ۷۳
مزید عمل اور کشادہ دلی کی ضرورت ۷۷
خواص و عوام دونوں کی تائید کا حصول ۷۸
اسلامی بیداری کو صحیح رخ دینے کی ضرورت ۸۰
رہنما خطوط ۸۴
سماجی کام ۸۶
کام کی ذمے داری سب پر ہے ۸۸

چوتھا باب : خاتمہ کلام ۹۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفے چند

الحمد للہ رب العالمین و الصلاۃ و السلام علی سید المرسلین

یہ سوال اکثر ذہنوں میں اٹھتا ہے کہ مسلم ممالک میں اسلامی تحریکیں اتنے طویل عرصہ سے سرگرم عمل ہیں، مخلص کارکنوں کی ایک خاصی تعداد بھی ان کے پاس ہے، لیکن اپنی ساری جدوجہد اور قربانیوں کے باوجود وہ کامیابی سے ہمکنار کیوں نہیں ہوئیں، مطلوبہ نتائج کیوں حاصل نہیں ہوئے اور منزل مقصود کیوں ان سے دور دور ہے؟

عالم اسلام کے مشہور صاحب قلم علامہ یوسف القرضاوی نے، جو تقریباً نصف صدی سے اسلامی تحریکوں سے وابستہ اور ان کے سرد و گرم سے بخوبی واقف ہیں، اپنی اس کتاب ''خرابی کہاں ہے'' میں اس اہم مسئلے کا جائزہ لیا ہے کہ کن کمیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے اسلامی تحریکوں کو کامیابی نہیں مل پا رہی ہے اور انہیں کیا مرض اور خرابی لاحق ہے۔ پھر ان کمیوں اور کوتاہیوں کی تشخیص و تجزیہ کے ساتھ انہیں دور کرنے کے لیے کچھ اہم تجاویز بھی پیش کی ہیں، جن میں خاص طور پر خود احتسابی، کشادہ ذہنی و کشادہ دلی، رواداری و اعتدال پسندی نیز صبر و تحمل سے کام لینے پر زور دیا گیا ہے اور خود پسندی، تنگ نظری، غلو و مبالغہ آرائی، جلد بازی اور جذباتیت سے پرہیز کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

مصنف نے اسلامی تحریکوں کی قربانیوں اور ان کے کارناموں کا بھی تحسین آمیز تذکرہ کیا ہے

اور کتنے مشکل حالات میں انہیں کام کرنا پڑتا ہے' ان کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی تحریکیں بالکل ہی ناکام ہیں اور انہوں نے کوئی مثبت اثر نہیں چھوڑا ہے یا کچھ بھی کارنامے انجام نہیں دیے ہیں۔

کئی برس پہلے جب یہ کتاب لکھی گئی تھی' صورت حال اب بھی تقریباً ویسی ہی ہے اور اس میں کوئی بنیادی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ اس لیے آج بھی یہ کتاب اتنی ہی اہمیت اور قیمت رکھتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی کارکن اس کا بغور مطالعہ کریں اور اس کی روشنی میں اپنے موقف اور طرز عمل کا جائزہ لیتے ہوئے ضروری تبدیلیاں عمل میں لائیں۔

اسلام کے تعلق سے صحیح فہم اور پھر صحیح طریق کار' ان بہت سی مشکلات سے اسلامی تحریکوں کو بچاسکتا ہے جن میں پھنس کر ا۔ ؒی توانائیاں بھی ضائع ہوتی ہیں اور وہ منزل مقصود سے دور بھی ہو جاتی ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو شرف ، قبولیت عطا فرمائے اور جس مقصد کے لئے لکھی گئی ہے وہ پورا ہو سکے۔

و للہ الحمد اولا و اخرا و ھو الموفق و المستعان

ابو مسعود اظہر ندوی

یکم رجب ۱۴۱۶ھ

۱۷- ابو الفضل انکلیو' جامعہ نگر

نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵

پہلا باب

خرابی کہاں ہے؟

اسلامی تحریکوں کی ناکامی کے تعلق سے کچھ دنوں سے یہ بحث چل پڑی ہے کہ آخراس کے اسباب کیا ہیں اور خرابی کہاں ہے؟

یہ مسئلہ یقیناً اس لائق ہے کہ اسلامی فکر و نظر کے رہ نما و علم بردار اس پر سنجیدگی سے غور و خوض کریں۔

سب سے پہلے تو یہ طے کرنا ضروری ہے کہ مسئلہ ہے کیا؟

کیا ہمیں وہ خرابی تلاش کرنی ہے جسے دور کیا جانا چاہیے؟

یا ہم خرابی کو تو جانتے ہیں لیکن اسے دور کرنے کا طریقہ نہیں جانتے۔

دوسرے الفاظ میں مسئلہ مرض کی تشخیص میں دشواری کا ہے یا علاج کی تجویز میں۔

یا پھر پورے یقین و صبر کے ساتھ دوا کو استعمال کرنے کا ہے چاہے وہ دوا کتنی ہی کڑوی کیوں نہ ہو۔

ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کیا ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں کوئی صحیح تشخیص کرنے والا طبیب دستیاب نہیں؟

یا مرض کو جڑ سے ختم کرنے والی دوا نہیں مل پا رہی ہے۔

یا پھر مریض ہی ناقابل علاج ہو چکا ہے اور اس پر دوا کا کوئی اثر نہیں ہوتا

پھر یہ بھی طے کرنا ضروری ہے کہ کیا بیماری پوری امت کو لاحق ہے یا صرف

اسلامی تحریکوں کو' یا بیک وقت دونوں کو۔

یعنی یہ کہ مریض کون ہے جس کا علاج کرنے اور مرض تشخیص کرنے اور دوا تجویز کرنے کی کوشش کی جائے۔

موضوع بحث صرف مشرق وسطیٰ ہی نہیں پوری امت اسلامیہ ہے۔ اور اگر پوری امت کے پس منظر میں اس موضوع پر غور کیا جائے تو مسئلہ کو محض خرابی قرار دینا ذرا کوتاہی ہوگی۔ مثلاً ایک طالب علم سفر کرتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ وہ کون سا علم حاصل کرنے جارہا ہے اور کہاں اور کس راستے سے جارہا ہے۔ راستے میں کار بگڑ جاتی ہے۔ ایک خرابی پیدا ہوگئی لہٰذا اب یہ پتا لگانا ضروری ہوگیا کہ خرابی کہاں اور کس وجہ سے پیدا ہوئی تاکہ اسے دور کیا جاسکے۔

اگر امت اسلامیہ کا حال دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ معاملہ کہیں زیادہ سنگین ہے۔ اسے صرف خرابی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ یہ تو شعور و احساس کی خامی' تشخص کا فقدان' منزل اوجھل ہوجانے اور پھر راستہ ہی کھودینے کا مسئلہ ہے۔

خود فراموشی

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس امت کے جو اوصاف بیان فرمائے ہیں:

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنہون عن المنکر و تومنون باللہ۔ (آل عمران-۱۱۰)

"(اب دنیا) میں بہترین گروہ تم ہو جسے (انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے) میدان میں لایا گیا ہے' تم بھلائی کا حکم دیتے ہو' برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

اگر ان اوصاف کی روشنی میں دیکھا جائے تو آج ہماری امت کوئی دوسری ہی

امت نظر آئے گی۔ چند مستثنیٰ حالتوں کو چھوڑ کر آج نہ امت بھلائی کا حکم دے رہی ہے، نہ برائی کی روک تھام کر رہی ہے بلکہ وہ اپنا شعور اور معیار ہی کھو چکی ہے اور بھلائی کو برائی اور برائی کو بھلائی سمجھنے لگی ہے یہاں تک کہ بعض لوگ تو برائی کا حکم دینے اور بھلائی سے روکنے لگے ہیں اور ایک عجیب و غریب فتنہ پیدا ہو چکا ہے جس میں اہل دانش و بینش حیران و ششدر نظر آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس امت کو معتدل و میانہ رو امت قرار دیا ہے:

و کذٰلک جعلناکم امۃ وسطا (البقرہ-۱۴۳)

"اور اسی طرح ہم نے تم مسلمانوں کو ایک "امت وسط" بنایا ہے"۔

جب کہ آج امت درمیانی پوزیشن اور طریق کار چھوڑ کر دائیں بائیں اور مشرق و مغرب کی طرف جھک رہی ہے اور اس نے وہ صراط مستقیم چھوڑ دی ہے جس پر چلنے والے انبیاء کرامؑ اور صدیقین و شہدا، و صالحین وغیرہ پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا بلکہ ان لوگوں کی سنت کی قدم بقدم پیروی کر رہی ہے جن پر خدا کا غضب نازل ہوا اور جو گمراہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس امت کو وحدت و اتحاد کی صفت سے نوازا تھا:

ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ و انا ربکم فاعبدون (الانبیاء-۹۲)

"یہ تمہاری امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے، اور میں تمہارا رب ہوں، پس تم میری عبادت کرو"۔

جب کہ آج ہم ایک امت کے بجائے استعمار کی خواہش اور اشاروں پر متعدد قومیں بن چکے ہیں جو ایک دوسرے کی دشمن اور باہم دست و گریباں ہیں۔

مختصر یہ کہ ہماری امت نے اللہ تعالیٰ کو فراموش کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے خود اپنے آپ کو بھلوا دیا:

و لا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانسٰھم انفسھم۔ (الحشر-۱۹)

"ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ' جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے خود انھیں ان کے نفس کو بھلوا دیا"۔

حق تو یہ ہے کہ اسلام کے بغیر اس امت کا کوئی وجود ہی نہیں اور نہ اس کے بغیر اسے کوئی کامرانی مل سکتی ہے' نہ وہ متحد ہو سکتی ہے اور نہ ہی اسے کوئی عزت کا مقام مل سکتا ہے۔ امیرالمومنین حضرت عمرفاروقؓ نے کیسی عمدہ بات کہی تھی "ہم ذلیل ترین قوم تھے اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ ہمیں عزت بخشی۔ اب ہم جب بھی اسلام کے بغیر (کسی اور ذریعہ سے) عزت حاصل کرنا چاہیں گے اللہ تعالیٰ ہمیں ذلیل کردے گا"۔

مادی ترقی کے معیار سے

اگر ہم موجودہ مادی ترقی کے معیار سے دیکھیں تو امت اسلامیہ بہت پیچھے نظر آئے گی۔ اپنی اقتصادی و دفاعی زندگی میں وہ دوسری قوموں پر بوجھ ہے نہ وہ اتنی روزی پیدا کرپاتی ہے جس سے جان و جسم کا رشتہ برقرار رہ سکے نہ وہ دفاعی پیداوار میں ہی اتنی خود کفیل ہے کہ اپنے اقتدار اعلیٰ کا تحفظ کرسکے۔

ایک طویل عرصے سے وہ حدیث کے الفاظ میں "کھیتی باڑی پر قانع اور بیلوں کی دم پکڑے رہنے (یعنی ہل چلانے) پر" عمل پیرا ہے تاہم اسے زرعی پیداوار اور دودھ تک درآمد کرنا پڑتا ہے۔

امت اسلامیہ کی مصیبت یہ ہے کہ اس کی صلاحیتیں---- اپنی کثرت و حجم و تنوع کے باوجود---- تعطل کا شکار اور جزوی طور پر مفلوج ہیں خواب غفلت کے دور میں جو کچھ ان سے چھوٹ چکا اس کی تلافی اور عالمی ترقی کے قافلے میں شمولیت

کے لیے وہ اپنی پوری صلاحیت بھر کام نہیں کررہی ہے' جب کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ دگنی محنت اور جدوجہد کرے۔

امت اپنی صلاحیتوں کا دسواں حصہ بھی استعمال نہیں کررہی ہے۔ اس کے نزدیک سب سے ارزاں چیز وقت' سب سے مشکل اور بھاری چیز کام اور سب سے بے قیمت چیز انسان ہے۔

ذہنی صلاحیت

ہماری ذہنی صلاحیتیں تعطل کا شکار ہیں' ہم دوسروں کی پیروی کرتے ہیں خود راستے نہیں نکالتے' ایجاد و اختراع کے بجائے نقل کرنا ہی قابل فخر سمجھتے ہیں' دوسروں کے افکار و نظریات کی خوشہ چینی کرتے ہیں خود اپنے لیے ذہن و دماغ کو استعمال نہیں کرتے اور یہ صورت حال صرف موروثی علوم کے ساتھ محدود نہیں' سائنس و ریاضی وغیرہ علوم کے ساتھ بھی ہے۔ ہم ان کے پرانے قاعدے رٹتے ہیں لیکن ان سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے ہم اس پر قناعت کیے بیٹھے ہیں کہ اہل مغرب ہمارے لیے سوچیں اور ایجادات کریں اور اس طرح تحقیق و اکتشاف اور ایجاد و اختراع کا سہرا ان کے سر بندھے ہمارے لیے یہی کیا کم فخر کی بات ہے کہ ہم ان کے ترجمے کرلیں۔

کتنے عار اور شرم کی بات ہے کہ بیس سے زیادہ عرب ممالک میں دوسری زبانوں کے ذریعہ سائنس کے مضامین کی تعلیم دی جارہی ہے اور اس طرح عربی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کی عدم صلاحیت کا اعتراف کیا جارہا ہے جب کہ محض تیس لاکھ افراد کا ملک اسرائیل اپنی عبرانی زبان میں سائنس کے مضامین کی تعلیم دے رہا ہے۔

یہاں تک کہ وہ انسانی علوم جو ہر قوم کے عقائد و خیالات اور تہذیب و

روایات نیز کائنات اور اس کے خالق' انسان اور اس کی حقیقت' زندگی اور اس کے انجام وغیرہ کے سلسلے میں اس کے نظریات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے ہیں انھیں بھی ہم لفظ بلفظ مغرب سے نقل کرنے لگے---- ہر شخص اس مکتب فکر کے مطابق جس سے اس نے سیکھا ہے---- جب کہ ان سب کا سرچشمہ مادہ پرستی ہی ہے جسے توریت وانجیل اور قرآن کریم سب میں ملعون قرار دیا گیا ہے۔

ہمارے یہاں جو تعلیمی نظام رائج ہیں وہ اسی تقلیدی ذہنیت کے مددگار بنتے ہیں امریکہ جیسا طاقت ور ترین ملک تو اپنے تعلیمی نظام کی خامیوں کو محسوس کرکے اپنے آپ کو خطرے میں محسوس کرتا ہے اور اس کی اصلاح کی جدوجہد پوری تندہی سے کرتا ہے اور چاند کی تسخیر بھی اسے روئے زمین پر اپنے شہریوں کے معیار میں گراوٹ کو محسوس کرنے سے نہیں روکتی۔ لیکن مسلم معاشروں میں تعلیمی معیار میں شرم ناک حد تک گراوٹ کو محسوس کرنے کے باوجود ہم لوگ چپ سادھے ہوئے ہیں اور کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔

ہمارا تعلیمی نظام کچھ ملازم تو تیار کرتا ہے لیکن صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ افراد تیار کرنے سے قاصر ہے۔ ہم پڑھنا بھی پسند نہیں کرتے کیوں کہ سمجھنے کے لیے محنت اور دماغ پر زور دینا پڑتا ہے جب کہ کاہلی وسستی ہمیں شہد سے زیادہ مرغوب ہے۔

اسرائیل کے ایک سابق وزیر دفاع موشے دایان نے ایک بار ایسا بیان دیا جس سے اسرائیلی توسیع پسندانہ عزائم اور امنگوں کا ثبوت ملتا تھا۔ یہودیوں نے اسے لعنت ملامت کی کہ اس طرح کے بیانات پڑھ کر عرب ان کے منصوبوں سے آگاہ ہو جائیں گے موشے دایان نے جواب دیا کہ: مطمئن رہو عرب لوگ پڑھتے ہی نہیں۔

کتنے تعجب کی بات ہے کہ جس امت کی کتاب (قرآن کریم) کی پہلی آیت ہی میں پڑھنے پر زور دیا گیا ہے وہ اچھی طرح پڑھنا ہی نہیں جانتی' اگر پڑھ بھی لیتی ہے تو

اسے اچھی طرح سمجھتی نہیں، اگر سمجھ بھی لیتی ہے تو اچھی طرح اس کے مطابق عمل نہیں کرتی اور اگر عمل بھی کرتی ہے تو اسے مسلسل جاری نہیں رکھتی۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت نے اسلام کو ایک عقلی و ادبی معجزہ بنایا، گزشتہ رسالتوں کی طرح محسوساتی معجزہ نہیں بنایا اور اس کا مقصد اس دین میں عقل کی اہمیت پر زور دینا ہی تھا۔

قرآن کریم اہل عقل و دانش کو مخاطب کرتا ہے، احمقوں اور بے وقوفوں کو نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکین اور یہودیوں پر مسلمانوں کی کامرانی کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ (مشرکین اور یہودی) سمجھتے نہیں اور عقل سے کام نہیں لیتے۔ آج مسلمانوں پر یہ صفت سب سے زیادہ صادق آتی ہے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے اور سمجھتے نہیں۔ کیوں کہ نہ وہ کائنات میں بکھری ہوئی اللہ کی نشانیوں کو سمجھتے ہیں نہ قرآن کریم کی آیتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جب کہ یہ آیتیں ان لوگوں کے لیے نازل کی گئی ہیں "جو سمجھتے ہیں" اور "جو جانتے ہیں"

ہم نے اللہ تعالیٰ کے دین میں نئی چیزیں گھڑیں جب کہ دین میں نئی بات نکالنا گمراہی ہے اور دنیاوی امور میں اپنی جہالت کی وجہ سے جمود و تعطل کا راستہ اختیار کیا جب کہ معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیے تھا یعنی دنیاوی امور میں ایجاد و اختراع اور دین کے معاملے میں اتباع اور پیروی۔ کیوں کہ دین کی روح اتباع اور پیروی ہے جب کہ دنیا کی روح ایجاد و اختراع۔

عملی تعطل

ہماری عملی صلاحیتیں تعطل کا شکار ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عمل ہی کے لیے پیدا کیا ہے بلکہ اس لیے پیدا کیا ہے کہ ہمیں آزمائے کہ ہم میں سے کون بہتر عمل

کرتا ہے:

لیبلوکم ایکم احسن عملا۔ (الملک-۲) "تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے"۔

اس تعبیر کا اپنا خاص اشارہ و مطلب ہے یعنی یہ کہ برے عمل والے اور اچھے عمل والے کے درمیان تمیز کرنا مقصود نہیں بلکہ مفروض یہ ہے کہ سبھی کا عمل اچھا ہو تمیز صرف اس کی کرنی ہے کہ ان میں سے کس کا عمل سب سے اچھا اور قابل ترجیح ہے۔

مسلمانوں سے تو ان کی زندگی کی آخری رمق تک کام کرتے رہنے کا مطالبہ ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "اگر قیامت بھی برپا ہو جائے اور کسی کے ہاتھ میں لگانے کے لیے پودا ہو اور وہ اسے لگانے کا موقع پا جائے تو اسے ضرور لگا دے"۔

اسلام میں عمل عبادت و جہاد ہے چاہے عمل دین کے لیے ہو یا دنیا کے لیے۔ البتہ نیت صحیح ہونی چاہیے اور اللہ تعالیٰ کی حدود کی پابندی ہونی چاہیے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ملت اسلامیہ تمام قوموں سے کم کام کرنے والی اور سب سے زیادہ باتیں بنانے والی اور بحث کرنے والی ہے۔ ہم باتیں بہت کرتے ہیں اور کام کم کرتے ہیں اور بسا اوقات کرتے بھی ہیں تو اہم کام کو چھوڑ کر غیر اہم کام کرتے ہیں بلکہ نفع بخش کام کو چھوڑ کر غیر نفع بخش کام کرتے ہیں۔

ہم اپنے ہی ارد گرد اسی طرح چکر لگاتے رہتے ہیں جیسے تیلی کا بیل ایک ہی جگہ چکر لگاتا رہتا ہے۔ عرب کے ایک مشہور احمق جحا کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے ایک رہٹ بنوائی جو ٹل سے پانی نکالتی تھی اور پھر اسی میں واپس گرا دیتی تھی۔ جب جحا سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے کہا کہ میرے لیے تو بس اس کے چلنے کی آواز کا سرور ہی کافی ہے۔

میں نے بہت سی عالمی اسلامی کانفرنسوں میں شرکت کی ہے اور انہوں نے بہت سی قابل قدر تجاویز بھی پاس کیں لیکن ' الا ماشاء اللہ کسی کو عملی جامہ پہننا نصیب نہیں ہوا اور وہ کاغذ پر سیاہ حروف سے آگے نہیں بڑھ سکیں۔

ایسا کیوں؟

کیا اس لیے نہیں کہ ہم اچھی اچھی باتیں کرنے کے تو عادی ہیں لیکن اچھا کام کرنے کے عادی نہیں۔ یا اس لیے کہ ہم خود باتیں کرتے ہیں اور دوسروں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ کام انجام دے دیں گے یا اس لیے کہ ہم فیصلے کرتے ہیں پھر پلٹ کر نہیں دیکھتے کہ ان فیصلوں کا کیا ہوا۔

میں سچی اور اچھی بات اور اس کے اثر کی اہمیت کو گھٹانا نہیں چاہتا۔ اسلام کا اولین معجزہ---- قرآن کریم---- بات ہی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بات ہی ہیں لیکن یہ نہیں ہونا چاہیے کہ بات عمل پر غالب رہے۔ شاید قرآن کریم کے تیئیس برسوں تک تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہونے کی وجہ بھی یہی تھی کہ اہل ایمان کو نازل شدہ آیات پر عمل کرنے کا موقع ملے اور وہ اپنی زندگی کو ان کے سانچے میں ڈھالتے چلے جائیں جیسا حضرت عائشہؓ سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے اس کی تعبیر ان الفاظ میں فرمائی کہ "آپ کا اخلاق قرآن (کی مجسم تصویر) تھا"۔ اور جیسا کہ ایک صاحب قلم نے صحابہ کرام کی صفت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "گویا ایک ایک صحابی دو پیروں پر چلتا ہوا قرآن کریم ہوتا تھا"۔

بات بھی ناگزیر ہے لیکن اگر عمل سے زیادہ ہو تو قابل مذمت ہو جاتی ہے' اگر سرے سے عمل ہی نہ ہو تو اور بھی زیادہ قابل مذمت ہے اور اگر قول و عمل میں تضاد ہو جائے تو انتہائی قابل مذمت ہے:

17

اسلامی

یا ایہا الذین امنوا لم تقولون ما لا تفعلون کبر مقتا عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون۔ ((الصف ۲-۳)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں"۔

اقتصادی صلاحیت

امت اسلامیہ مرکزی طور پر اس خطہ میں آباد ہے جو محل وقوع کے لحاظ سے اہم ترین اور انتہائی زرخیز اور بہترین ہے اور معدنیات کے بے پناہ ذخیروں سے سرفراز ہے۔ لیکن ہم نے ان معدنیاتی ذخیروں کو اچھی طرح استعمال کیا اور نہ خام مواد کو مصنوعات میں تبدیل کیا نہ ساری قابل کاشت زمینوں پر زراعت کی اور جتنے تھوڑے سے حصے میں کاشت بھی کی وہ اکثر قدیم ترین آبائی طریقے سے کی۔ ناقابل کاشت زمینوں کو قابل کاشت بنانے کی جدوجہد بھی نہیں کی جسے فقہی اصطلاح میں مردہ زمین کو زندہ کرنا کہا جاتا ہے بلکہ زرخیز زمینوں میں عمارتیں تعمیر کرکے انھیں بھی بے کار کرڈالا۔

دوسرے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ ہم مردہ زمینوں کو زندہ کرنے کے بجائے زندہ زمینوں کو مردہ بنارہے ہیں۔

ہماری شناخت یہ بن چکی ہے کہ چیزیں پیدا کرنے کے بجائے انھیں استعمال کرنے والے صارفین ہیں اور چیزیں خود بنانے کے بجائے انھیں درآمد کرتے ہیں۔ پھر اگر کچھ بناتے بھی ہیں تو جن کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے انھیں چھوڑ کر بے کار چیزیں بناتے ہیں۔

ہم اس پر تو فخر کرتے ہیں کہ ہمارے پاس دنیا کی بہترین کار ہے لیکن ایک

سائیکل بھی خود سے بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

جب ہمارا خطہ زرعی ہے اور ایک کنواں بھی کھود نہیں پاتے آسمان سے بارش ہی پر انحصار کیے رہتے ہیں اور پیداوار کے وسائل کے بجائے ظاہری خوش حالی کے طمطراق کو اہمیت دیتے ہیں تو اس میں کیا تعجب کی بات ہے کہ ہمارے خطہ میں لکھوکھا لوگ بھک مری اور غربت کا شکار ہوں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ظالم بستیوں کے لوگوں کی صفت بیان فرمائی ہے:

فهی خاویة علی عروشها و بئر معطلة و قصر مشید (الحج-۴۵)

"تو وہ اپنی چھتوں پر الٹی پڑی ہیں، کتنے ہی کنوئیں بے کار اور کتنے ہی قصر کھنڈر بنے ہوئے ہیں"۔

جب کہ محلوں کی تعمیر سے پہلے پانی کے وسائل کی فراہمی پر توجہ دینا ان کے لیے زیادہ مناسب اور ضروری تھا۔ آج پورا عالم اسلامی "ترقی پزیر" ممالک میں شمار ہوتا ہے اور ظاہر ہے "ترقی پزیر" لفظ "پس ماندہ" کی ایک خوب صورت تعبیر ہے۔ جہاں لوگ اونٹوں اور گدھوں کی سواری کرتے ہوں جب کہ دوسرے ہوائی جہازوں میں اڑتے پھر رہے ہیں پھر اگر وہ کاریں اور ہوائی جہاز استعمال بھی کرتے ہیں تو دوسروں کے بنائے ہوئے۔

کیا یہ الم ناک بات نہیں کہ ہم آج تک دوسروں پر بوجھ بنے ہوئے ہیں نہ اپنی ضرورت کے مطابق غذائی اشیاء پیدا کرپاتے ہیں اور نہ ہی اپنی حفاظت میں معاون صنعتیں قائم کرسکے ہیں۔

افریقہ کے متعدد مسلم ممالک میں لوگ خشک سالی اور بھکمری کا شکار ہیں۔ جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے بھی انھیں کچھ نہیں مل پاتا۔ اگر پہلے سے منصوبہ بندی کی گئی ہوتی تو کنوئیں کھودے جاسکتے تھے اور زمین کے نیچے سے پانی نکال کر پھیلایا

جاسکتا تھا۔ اگر بارش نہ ہوتی تو اس طرح کچھ پیداوار حاصل کی جاسکتی تھی۔

کچھ مسلم ممالک میں بکثرت پھل پیدا ہوتے ہیں لیکن وہ انھیں محفوظ کرنے اور برآمد کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں کرسکے اس لیے انھیں زمین میں دفن کرنے پر مجبور ہیں۔

کیا درماندگی کی یہ وہی قسم نہیں ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پناہ مانگا کرتے تھے:

اللھم انی اعوذ بک من العجز و الکسل۔ (بخاری)

اے پروردگار! میں تیری پناہ مانگتا ہوں درماندگی اور کاہلی سے۔

پھر آپؐ نے واضح طور پر یہ ہدایت بھی فرمائی ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو لیکن درماندگی نہ اختیار کرو"۔ (مسلم)

"اللہ تعالیٰ درماندگی پر ملامت کرتا ہے ہاں دانش مندی سے کام لینا ضروری ہے"۔ (ابوداؤد)

اگر ہر ملک تنہا کام انجام دینے سے عاجز و بے بس ہے تو یہ سب ممالک باہم مل کر تو کام انجام دے سکتے ہیں۔

مسلم ممالک میں باہمی تعاون کہاں ہے؟

افرادی قوت

ہماری افرادی قوت بھی تعطل کا شکار ہے۔ اگرچہ مسلمان ایک ارب سے زیادہ ہیں تاہم انتشار اور پھوٹ میں مبتلا ہیں۔

ہم نے اللہ کی روشنی سے آنکھیں بند کرلیں تو طاغوتی اندھیروں نے ہمیں جکڑ لیا۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کی واحد راہ سے روگردانی کی تو بے شمار راستوں میں بکھر گئے۔

کچھ دائیں، کچھ بائیں، کچھ مشرق کی طرف اور کچھ مغرب کی طرف۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کا یہ انتباہ فراموش کر دیا کہ:

و ان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ و لا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ۔ (الانعام-۱۵۳)

اور یہی میرا سیدھا راستہ ہے، لہٰذا تم اسی پر چلو، اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے۔

تو پھر ہم پھوٹ کا شکار ہو گئے اور پھوٹ سے تو بھاری تعداد بھی کمزور پڑ جاتی ہے جب کہ اتحاد کم تعداد کو بھی طاقت ور بنا دیتا ہے۔

ایک ایسے زمانے میں جب بڑے گروپوں کی زبان میں بات کی جاتی ہے اور کم تعداد تنہا اپنے بل پر زندگی گزارنے کی طاقت نہیں رکھتی اور جب ہم ترقی یافتہ ممالک کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ باہم فوجی گروپوں اور معاہدوں میں شامل ہو رہے ہیں اور سیاسی گروپوں کے ساتھ اقتصادی مشترکہ منڈیاں بھی قائم کر رہے ہیں، ہم آپس میں تعاون و ہم آہنگی سے نا آشنا ہیں۔

امت اسلامیہ قومی لحاظ سے عرب و عجم میں، نظریاتی اعتبار سے ترقی پسندوں اور رجعت پسندوں میں اور سیاسی اعتبار سے مغرب یا مشرق کے حامیوں میں منقسم ہے اسی طرح اور بھی بہت سی تقسیمیں ہیں۔

توقع تو یہ کی جاتی تھی کہ ہم اپنی افرادی قوت سے فائدہ اٹھائیں کیوں کہ افرادی قوت کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ جمال الدین افغانی نے ایک بار ہندوستانیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

"اگر تم کروڑوں لوگ مکھی بن کر انگریزوں کے کان میں بھنکنے لگتے تو ان کے کان بہرے ہو گئے ہوتے"۔ لیکن ہم نے اس زبردست انسانی طاقت سے کوئی فائدہ

نہیں اٹھایا بلکہ اس نعمت کو بھی ایک المیہ بنادیا۔ قرآن تو کہتا ہے:

و اذکروا اذ کنتم قلیلا فکثر کم۔ (الاعراف-۸۶) "یاد کرو وہ زمانہ جب کہ تم تھوڑے تھے پھر اللہ نے تمہیں بہت کر دیا۔

لیکن ہمارے نام نہاد مصلحین سب سے زیادہ اس تعداد ہی کو کم کرنے کی فکر میں مبتلا ہیں۔ دنیا میں کتنے ممالک ہیں جنھیں کثرت آبادی سے کوئی شکایت نہیں بلکہ انہوں نے باشندوں کی اس بھاری تعداد کو پیداوار بڑھانے کے کام میں لگا کر فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور عملاً اٹھایا بھی۔

روحانی صلاحیت

اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہماری روحانی صلاحیت تعطل کا شکار ہے ہم نے اپنے اندر روح کی پھونک والے عنصر پر مٹی اور گارے والے عنصر کو غالب کر لیا ہے جب کہ روح والا عنصر ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام اور بعد میں ہماری عزت افزائی کا سبب تھا:

فاذا سویتہ و نفخت فیہ من روحی فقعوا لہ ساجدین۔ (الحجر-۲۹)

"جب میں اسے پورا بنا چکوں' اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں' تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا"۔

معصیت کی ہوائیں چلیں اور انہوں نے ہمارے دلوں میں روشن خشیت اور خوف خدا کی شمعوں کو بجھادیا اور یہ حالت اتنی طویل ہوگئی کہ ہمارے دل ہی سخت ہوگئے جس طرح پہلے اہل کتاب کے دل سخت ہوگئے تھے:

فھی کالحجارۃ او اشد قسوۃ ۔ (البقرہ-۷۴)

"پتھروں کی طرح سخت' بلکہ سختی میں کچھ ان سے بھی بڑھے ہوئے"۔

ہمارے تعلیمی نصابوں اور تربیتی اداروں نے ہمارے دلوں میں ربانی جذبات جاگزیں کرنے میں کوئی مدد نہیں دی۔ شاعر مشرق علامہ اقبال نے کیا خوب کہا تھا کہ جدید تعلیم گاہیں نئی نسل کی آنکھیں کھول کر انھیں حقائق و معلومات سے تو آگاہ کر دیتی ہیں لیکن اس کی آنکھوں کو آنسوؤں اور دلوں کو خشوع و خضوع سے بے گانہ ہی رکھتی ہیں۔

ہم نے دین کو، جو ہمارے وجود کی روح اور ہماری بقا و تشخص کا راز تھا، غلط سمجھا یہاں تک کہ اصل جوہر اور روح کے بجائے ظاہری شکلوں ہی پر ساری توجہ دینے لگے جب کہ دین کی سب سے اہم چیز دلوں کی تطہیر اور تزکیہ نفس ہے:

قد افلح من زکٰھا و قد خاب من دسٰھا۔ (الشمس-۹-۱۰)

"یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا، اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا"۔

جب دل بدلتے ہیں تو پورا معاشرہ بدل جاتا ہے اور تاریخ کا دھارا نیا رخ اختیار کرلیتا ہے:

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم۔ (الرعد-۱۱)

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو بدل نہیں دیتی"۔

یہ صحیح ہے کہ ہم عیدین اور دینی تقریبیں مناتے ہیں، اکثر مسلم ممالک میں جمعہ کو تعطیل بھی کرتے ہیں، قرآن کریم اور دینی کتابیں بھی چھاپتے ہیں وغیرہ وغیرہ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم نے دین کا حق ادا کر دیا اور اس کی حدود کی پابندی کرلی۔ ہم دین کو مانتے بھی ہیں لیکن اس کے خلاف سرکشی بھی کرتے ہیں جیسے کوئی کسی بزرگ کا ہاتھ تو چومے لیکن اس کی نصیحت نہ مانے۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ یہ طرز عمل ہمیں ان لوگوں کے زمرے میں نہ پہنچا دے:

الذین اتخذوا دینھم لھوا و لعبا و غرتھم الحیوۃ الدنیا (الاعراف-۵۱)

جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تفریح بنالیا تھا اور جنہیں دنیا کی زندگی نے فریب میں مبتلا کررکھا تھا"۔

کسی امت کا سب سے برا حال یہی ہو سکتا ہے کہ اس میں دین لہو و لعب کی چیز بن جائے اور لہو و لعب کو دین مانا جانے لگے۔

ہم تو ایسے ہوگئے کہ اپنی دیواروں کو قرآنی آیات سے سجانے لگے جب کہ قرآن پر عمل کے ذریعہ اپنی زندگی سنوارنا بھول گئے۔ ہم مردوں پر تو قرآن پڑھتے ہیں لیکن زندوں میں اس کا عمل دخل نہیں ہونے دیتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ محض قرآن شریف کو ہاتھوں میں لینے اور اس کی زبانی تلاوت ہی میں ساری برکت ہے جب کہ حقیقی برکت تو اس کی پیروی اور زندگی میں اسے نافذ کرنے میں ہے:

و ھذا کتاب انزلناہ مبارک فاتبعوہ و اتقوا لعلکم ترحمون۔ (الانعام-۱۵۵)

"اور اسی طرح ہم نے یہ کتاب نازل کی ہے ایک برکت والی کتاب' پس تم اسی کی پیروی کرو' اور تقویٰ کی روش اختیار کرو' بعید نہیں کہ تم پر رحم کیا جائے"۔

ہم نے اللہ تعالیٰ پر یہ جسارت کررکھی ہے کہ اس کی شریعت کو معطل اور اس کے احکام کو جامد کررکھا ہے اور اس کے علم و حکمت پر اس طرح دست درازی کررہے ہیں گویا ہم اس ذات پاک کے مقابلے میں اس کی مخلوق اور اس کے مفادات کا زیادہ علم رکھتے ہیں:

قل انتم اعلم ام اللہ۔ (البقرہ-۱۴۰) "کہو" "تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ"۔

الا یعلم من خلق و ھو اللطیف الخبیر۔ (الملک-۱۴)

"کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے' حالاں کہ وہ باریک بین اور باخبر ہے"۔

میں نے بارہا عرض کیا ہے اور برابر عرض کرتا رہوں گا کہ اس امت کی شخصیت کی کنجی اور اس کی تمام طاقتوں کا سرچشمہ ایمان ہے' اسلامی ایمان جو پہلے امت کو بہترین امت بنا چکا ہے اور دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں پر ---- تعداد و سامان کی سخت قلت کے باوجود ---- فتح یاب کر چکا ہے۔

اس ایمان کی بدولت امت مشرق سے یلغار کرنے والے تاتاریوں کو اور مغرب سے ہلہ بولنے والے صلیبیوں کو مغلوب کر چکی ہے اور آج بھی اس کے ذریعہ ان کے وارثین کو مغلوب کر سکتی ہے۔ یہودیوں نے اپنی روحانی صلاحیتوں اور دینی محرکات کو استعمال میں لا کر اپنی امت کو خواب غفلت سے بیدار کر لیا' اپنے بکھرے ہوئے افراد کو یکجا کر لیا اور اپنی مردہ زبان کو زندہ کر لیا' یہاں تک کہ جب وہ ہمارے مقابلے پر آئے تو ان کے ساتھ توریت تھی جب کہ ہمارے ساتھ قرآن نہیں تھا۔

وہ یہودیت پر اکٹھا اور متحد ہو گئے اور ہم اسلام پر منتشر ہو گئے۔ انہوں نے تلمود کی تعلیمات کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور ہم بخاری و مسلم کا مذاق اڑاتے رہے۔ ان کے رہ نماؤں نے یہ کہنے میں فخر محسوس کیا کہ ہمارے نبیوں نے ہمیں یہی سکھایا ہے اور ہمارے رہ نما مارکس و لینن پر فخر کرتے رہ گئے۔

ہمارے پاس عظیم ترین عقیدہ اور مکمل ترین رسالت ہے۔ ہمارے پاس ہی وہ تنہا آسمانی کتاب ہے جو کسی بھی تحریف سے محفوظ ہے۔ لیکن ہم خواب غفلت کے مزے لے رہے ہیں اور طاقت کے سرچشموں سے غافل ہیں۔ آج ہماری تعداد بہت بڑی ہے لیکن حدیث نبویؐ کی تعبیر کے مطابق ہم سیلاب کا جھاگ بن کر رہ گئے ہیں (جیسا کہ ابوداؤد میں حضرت ثوبانؓ کی روایت میں ہے)۔

سبب یہی ہے کہ ہماری باطنی حالت خراب ہو چکی ہے اور ہمارے دل اس

قوت ایمانی سے محروم ہیں جو مومن کی نگاہ میں دنیا کو حقیر اور اللہ کی راہ میں موت کو محبوب بنا دیتی ہے گویا ہم اس کمزوری کا شکار ہو چکے ہیں جسے مذکورہ بالا حدیث ہی میں دنیا کی محبت اور موت سے نفرت کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔

پھر آخر تعجب کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ ایک ارب افراد پر مشتمل "سیلاب کی جھاگ" تیس لاکھ یہودیوں سے شکست کھا جائے۔

ذمے دار کون؟

افتراق و انتشار اور تباہی و بربادی کی یہ حالت ہے جس میں آج ہماری امت مبتلا ہے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس کا ذمے دار کون ہے؟ ہم چوں کہ اس مسئلے پر ایک جج کی طرح نہیں بلکہ ایک داعی کی حیثیت سے غور کر رہے ہیں اس لیے ذمے داری متعین طور پر کسی شخص یا گروپ پر ڈالنا ہمارا کام نہیں۔ نہ ذمے داروں پر انقلابی یا عوامی عدالت میں مقدمہ چلانا مقصود ہے۔ مقصد صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ خرابی کہاں سے پیدا ہوئی تاکہ اسے دور کیا جا سکے اور اس مرض کا علاج تلاش کیا جا سکے۔

کیا ذمے داری حکام اور ارباب اقتدار پر عائد ہوتی ہے؟ اکثر لوگ صورت حال کی ذمے داری حکام پر ڈالتے ہیں اور اس کے کئی اسباب ہیں:

۱۔ لوگ عادتاً یہ پسند کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیں اور ذمے داری دوسروں پر ڈال دیں اسی لیے عوام ساری ذمے داری حکام پر ڈال دینا چاہتے ہیں۔

۲۔ مسلم عوام خاص طور پر اپنے حکام کے ہاتھوں بہت کچھ مصائب جھیلتے رہے ہیں اس لیے حالات کی ذمے داری بھی انھیں پر ڈالتے ہیں۔

۳۔ذمے داری صلاحیت و طاقت کے بقدر ہی ہوتی ہے حکام نے تسلط تو جما لیا لیکن عوام کو ان سے کوئی خوش گمانی نہیں رہی۔ نہ وہ ایسے تھے کہ اس آیت کے مصداق ہوتے:

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلٰوۃ و اتوا الزکوۃ و امروا بالمعروف و نھوا عن المنکر۔ (الحج-۴۱)

"یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔

بلاشبہ حکام کے کندھوں پر آج کے حالات کی بڑی حد تک بلکہ سب سے زیادہ ذمے داری ہے لیکن یہ بھی اپنی جگہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ حکام اکثر اپنے عوام ہی کے مشابہ ہوتے ہیں اور اپنے معاشروں ہی سے ابھرتے ہیں یہاں تک کہ جو حکام اپنے عوام پر مسلط ہو جاتے ہیں ان کا اقتدار بھی انھیں عوام کی حمایت یا کم از کم چشم پوشی و خاموشی کی بدولت برقرار رہتا ہے جیسا کہ مثل ہے جیسے عوام ہوں گے ویسے ہی حکمراں بھی انھیں ملیں گے۔

طبرانی میں حضرت حسن بصریؒ کا ایک واقعہ ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو حجاج کو بددعا دیتے ہوئے سنا تو فرمایا ایسا نہ کرو۔ یہ تو خود تمہارے اپنے اعمال کی سزا مل رہی ہے۔ ہمیں ڈر لگتا ہے کہ اگر حجاج مرگیا یا معزول کردیا گیا تو کہیں تم پر بندر اور خنزیر نہ مسلط کردیے جائیں کیوں کہ ایسا مروی ہے کہ تمہارے اعمال ہی تمہارے حکام ہوتے ہیں جیسے تم ہوگے ویسے ہی اشخاص تم پر حاکم بنائے جائیں گے۔ (دیکھیے کشف الخفاء و الالباس جلد ۲ صفحہ ۱۶۶)

علماء کی ذمے داری

کیا ذمے اری علماء پر ہے کیوں کہ وہ انبیاء کے وارث، حق کے داعی و علم بردار اور اس مخلوق کے رہ نما ہیں اور ان سے اللہ تعالیٰ نے یہ عہد لے رکھا ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کا دین واضح طور پر بتائیں گے اور اسے چھپائیں گے نہیں جبکہ بعض علماء

حق بات کہنے میں کوتاہی کا شکار ہوئے، بعض نے حکام کی ہم نوائی کی اور علم کو سیاست کا خدمت گزار بنادیا اور "حسب ضرورت فتویٰ" دینے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ آج میدان میں تنہا علماء ہی نہیں رہ گئے ہیں جیسا کہ پچھلے زمانوں میں ہوا کرتا تھا۔ آج جن کی باتیں پڑھی اور سنی جاتی ہیں اور ذرائع ابلاغ سے لوگوں تک پہنچتی ہیں وہ منبروں پر بولنے والوں کے مقابلے میں عوام پر زیادہ اثر ڈالنے کی پوزیشن میں ہیں اگرچہ دین کی بات کی اپنی ایک الگ طاقت ہوتی ہے جو کسی دوسری بات کو حاصل نہیں ہوتی۔

آج علماء کے ساتھ ایک مشکل یہ بھی ہے کہ وہ حکام کے یہاں ملازمت پر مجبور ہیں وہی علماء کو نوکری دینے اور ہٹانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ پہلے کے علماء جیسے نہیں رہ گئے جو کسی ہنر یا تجارت کو اپنا پیشہ بناتے تھے تاکہ کسی کے محتاج نہ رہیں۔

کسی حاکم سے حضرت حسن بصریؒ کی طاقت و اثر کا راز معلوم کیا گیا تو اس نے صاف صاف کہا کہ ہم ان کے دین کے ضرورت مند ہیں اور وہ ہماری دنیا سے بالکل بے نیاز ہیں۔

اب اگر علماء حکام کے پاس موجود دنیا کے محتاج ہو جائیں اور حکام علماء کے پاس موجود دین سے بے نیاز ہو جائیں تو پھر کیا حال ہوگا؟ پھر بھی علماء میں ایسے لوگ رہے ہیں جنھوں نے امانت کا حق ادا کیا اور اپنا پیغام پہنچانے میں کسر نہیں چھوڑی اور اس راہ میں سخت اذیتیں جھیلیں بلکہ بعض نے تو اپنی جانیں تک قربان کردیں۔

عوام کی ذمے داری

پھر کیا ذمے داری عوام پر عائد ہوتی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ذمے داری مشترک ہے اور ہر فریق کا اپنی طاقت و صلاحیت بھر

اس میں حصہ ہے، عالم کی ذمے داری جاہل سے زیادہ ہے۔ بر سر اقتدار کی ذمے داری اس شخص سے زیادہ ہے جس کے پاس کوئی اختیار نہیں۔ مال دار کی ذمے داری اس شخص سے زیادہ ہے جس کے پاس کوئی دولت نہیں۔ تاہم سبھی ذمے دار ہیں۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام لوگوں پر اپنے اپنے موقع کے لحاظ سے ذمے داری ڈالی ہے: "تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور جس چیز کی نگہبانی اس پر عائد ہوتی ہے اس کے بارے میں جواب دہ ہے"۔

اسلام کسی خاص طبقے کے لوگوں کو دین کا علم بردار اور ذمے دار نہیں بناتا بلکہ ہر مسلمان دین دار ہوتا ہے اور پوری امت باہم یک جہتی کے ساتھ اللہ کے فرائض و احکام اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمے دار ہے:

و المومنون و المومنات بعضهم اولياء بعض يامرون بالمعروف و ينهون عن المنكر۔ (التوبہ-۷۱)

"مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں"۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ کسی داعی کی تقریر کے بعد ایک سامع نے سوال کیا: تیس برس سے آپ بات کہہ رہے ہیں لیکن کام کیا کیا؟ داعی نے جواب دیا: تم بھی تو تیس برس سے سن رہے ہو تم نے کیا کیا؟ حق بات یہ ہے کہ سننے والے اور سنانے والے دونوں پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بات کو عملی جامہ پہنائیں اور خیالات و نظریات کو حقیقت کے روپ میں ڈھالیں اگرچہ ذمے داری کی نوعیت میں فرق ہو گا۔

اسلامی تحریکوں کی ذمے داری

کوئی شخص اسلامی تحریکوں پر انگلی اٹھا سکتا ہے کہ آج امت کو جس تباہی و بربادی اور انتشار و گم راہی کا سامنا ہے اس کی ذمے داری انھیں پر ہے۔ کیوں کہ انھیں سے توقع تھی کہ وہ امت کے کارواں کو ساحل تک پہنچائیں گی اور انھیں کے ہاتھوں اس کے خواب شرمندۂ تعبیر ہوں گے اور مصائب ختم ہوں گے۔ عوام کی بھاری تعداد نے انھیں پر اعتماد کیا اور ہزاروں عابد و زاہد اور مرد میدان ان کے اردگرد جمع ہوئے۔ پھر انھیں اتنا لمبا عرصہ بھی ملا جس میں ان کی کوششیں بہ آسانی بار آور ہو سکتی تھیں۔

اس مرحلہ پر پہنچ کر ذرا اسلامی تحریکوں کا محاسبہ بھی کر لیا جائے۔

دوسرا باب

اسلامی تحریکیں

بڑی امیدیں اور توقعات تھیں کہ اسلامی تحریکیں امت اسلامیہ کا سفینہ صحیح راستے سے ساحل مراد تک پہنچادیں گی کیوں کہ ان کے پاس کتاب الٰہی اور سنت نبوی کی صورت میں گائڈ بھی موجود ہے اور اسلامی شریعت اور ابدی ورثہ کی صورت میں تفصیلی نقشہ بھی۔ یہاں کوئی خاص اسلامی تحریک مراد نہیں بلکہ وہ ساری اسلامی کوششیں مراد ہیں جو اجتماعی و عوامی بنیاد پر شروع کی گئیں، اور امت کا ضمیر جن کا سرچشمہ رہا اور جو اس کی شخصیت، تمناؤں، مسائل، عقائد و نظریات، ٹھوس اقدار اور نئی امنگوں کی ترجمان تھیں اور جنھوں نے خلافت کا قلعہ منہدم ہونے کے بعد عقیدے کی بنیاد پر امت کی وحدت کو اپنی کوششوں کا مرکز بنایا۔

اس دائرے میں وہ ساری تنظیمیں اور جماعتیں شامل ہیں جو دین کو از سرنو زندہ کرنے، شریعت کو نافذ کرنے، اس کے ذریعہ امت میں زندگی کی روح پھونکنے، اسے معاشرے کی رہ نمائی کے تعلق سے اس کا تاریخی و فطری مقام واپس دلانے، اور عقیدہ و عبادت، اخلاق و طرز عمل اور فکر و شعور وغیرہ، زندگی کے تمام میدانوں میں برپا کرنے کے لیے سرگرم کار ہوئیں۔

لیکن یہ اسلامی تحریکیں امت کو ساحل مراد تک نہ پہنچا سکیں نہ ان سے لوگوں نے جو زبردست امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں اور انھیں خود بھی جو توقعات

تھیں ---- وہی پوری ہو سکیں۔

اس ناکامی اور اس کے اسباب کے تعلق سے بہت سی باتیں خود ان تحریکوں سے وابستہ لوگوں کی زبانوں پر بھی آئیں اور ان کے مخالفین نے بھی کیں۔ کیا یہ اسباب تحریکوں کے اختیار سے باہر کے تھے؟ جیسے سمندر کے بیچوں بیچ کسی جہاز کو طوفان گھیر لے یا بھنور پھنسا لے یا نیچے سے چٹانیں حائل ہو جائیں یا مسلح ڈاکو ہلہ بول دیں یا دشمن کی آبدوزیں حملہ آور ہو جائیں یا اس طرح کی کوئی اور مشکل راہ میں حائل ہو جائے جو اس کے اندازے سے باہر ہو اور اس سے بے اندازہ نقصان پہنچ جائے اور جہاز اور اس کے ملاح و مسافر سب کے سب یا کچھ غرق ہی ہو جائیں۔

یا یہ اسباب خود ان تحریکوں کے اندر پوشیدہ تھے یعنی یہ کہ خرابی خود جہاز میں تھی اور اس نے متوقع طوفانوں اور مشکلات کا سامنا کرنے کی ضروری تیاری ہی نہیں کی تھی۔

یا پھر کمی جہاز کے ناخداؤں میں تھی جنھوں نے جہاز کو خطرناک لہروں اور چٹانوں کے راستے پر ڈال دیا اور امکانی خطرات کا اندازہ ہی نہیں کیا۔

شاید انصاف اور حقیقت پسندی دونوں ---- یعنی بیرونی اور اندرونی اسباب ---- کو ایک ساتھ قصوروار ٹھہرائیں۔

اگر ہم اسلامی تحریکوں کی تاریخ لکھیں یا ان پر نقد و تبصرہ کریں تو یہ جائز نہیں ہوگا کہ ایک پہلو کو نظرانداز کر کے دوسرے پہلو ہی پر ساری ذمے داری ڈال دیں۔ ایسی صورت میں ہم افراط و تفریط کا شکار ہو جائیں گے۔

ہم میں سے بعض لوگ کسی بھی بیرونی اثر کو تسلیم نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح کی بات محض وہم و خیال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی جیسے قدیم زمانے میں عنقا اور بھوت پریت کا تصور تھا۔ یہاں تک کہ مجھ سے ایک دوست نے ایک دن کہا:

ملیسیت نام کی کوئی چیز پائی نہیں جاتی جیسا کہ آپ لوگوں کا خیال ہے۔ یہ تو صرف اپنے اپنے مفادات ہیں جن کے پیچھے لوگ بھاگ رہے ہیں۔

حالاں کہ بے شمار واقعات و حقائق اس بات کی تردید کرتے ہیں۔ دوسری طرف کچھ لوگ ہر چیز کی وجہ بیرونی دخل اندازی اور ہمارے حکمرانوں پر اس کے اثرات کو سمجھتے ہیں اور بسا اوقات اس میں اتنا مبالغہ کرتے ہیں جیسے بیرونی طاقتیں خدا کی طرح بااختیار اور ہر تصرف پر قدرت رکھتی ہیں ان کے خیال میں تمام حکمراں سیاست داں اور رہ نما محض کٹھ پتلی کی حیثیت رکھتے ہیں اور نادیدہ ہاتھ انھیں خفیہ طور پر حرکت دیتے رہتے ہیں بالفاظ دیگر وہ بس شطرنج کے مہرے ہیں۔

گویا اسلامی تحریکوں میں کوئی خرابی نہیں نہ انھیں اپنا محاسبہ کرنے اور اپنے منصوبوں اور پالیسیوں پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

دونوں گروپوں کے درمیان اعتدال پسندی ہی صحیح موقف ہے اور یہی علم و انصاف کا تقاضا بھی ہے۔

ذمے داری کی حد

میرے خیال میں یہ انصاف نہیں ہوگا کہ آج مسلمان جس انتشار و پس ماندگی کا شکار ہیں اس کی ساری ذمے داری اسلامی تحریکوں پر ڈال دی جائے۔ یہ تو صدیوں کے جمود و تعطل، استعماری دور اور آزادی کے بعد غلط طرز حکمرانی کی پیداوار ہے۔

بلاشبہ اسلامی تحریکوں کو جو مادی و اخلاقی وسائل حاصل ہوئے ان کے بقدر ان پر بھی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ ان وسائل کو پوری طرح استعمال نہیں کیا جاسکا، کچھ کو نظر انداز کیا گیا اور کچھ کو صحیح طور پر استعمال نہیں کیا جاسکا۔

لیکن اسلامی تحریکیں بھی اس میں کسی حد تک معذور ہیں۔

امت اسلامیہ کو پیش آنے والے واقعات، اس کے رجحانات اور اس کی سرگرمیوں میں اسلامی تحریکوں کا کردار تنہا یا سب سے بڑے عامل و محرک کا نہیں رہا ہے۔

دوسری طرف اسلام سے خائف اور سرکشی کی طاقتیں اندر سے اور اسلام سے نفرت کرنے والی استعماری طاقتیں باہر سے برابر اسلامی تحریکوں کی مزاحمت کرتی رہی ہیں اس لیے یہ تحریکیں ایک آزمایش سے نکل نہیں پاتیں کہ دوسری آزمایش کا شکار ہو جاتی ہیں اور پرانے زخم مندمل نہیں ہونے پاتے کہ نئے زخم لگ جاتے ہیں۔

بہرحال کامیابی و ناکامی کو صحیح و غلط اور حق و باطل کا معیار قرار نہیں دیا جاسکتا کہ جو بھی کامیاب ہو جائے وہ حق پر ہے اور جو بھی ناکام ہو جائے وہ باطل پر۔ اس معیار کو نہ دین تسلیم کرتا ہے نہ منطق، تاریخ اور حقیقت ہی مانتے ہیں۔ اسلامی تحریکوں کا اولیں کردار و عمل لوگوں کو اس کی دعوت دینا ہے کہ وہ کجی کو درست کریں، بگاڑ کی اصلاح کریں اور جو کچھ ضائع ہو چکا ہے اس کی تلافی کریں۔

داعی کبھی کامیاب ہوتا ہے، کبھی ناکام ہو جاتا ہے، کبھی اسے قبولیت حاصل ہوتی ہے کبھی مسترد کر دیا جاتا ہے۔ حضرت نوح نے کتنے لمبے عرصے تک مختلف طریقوں سے اور مختلف اوقات میں اپنی قوم کو دعوت دینے کی اپنی ہر امکانی کوشش کی لیکن ان کی بیوی اور بیٹے تک جیسے قریب ترین لوگوں نے بھی اسے نہیں مانا:

قال رب انی دعوت قومی لیلا و نھارا فلم یزدھم دعائی الا فرارا و انی کلما دعوتھم لتغفر لھم جعلوا اصابعھم فی اذانھم و استغشوا ثیابھم و اصروا و استکبروا استکبارا۔ (نوح-۵-۷)

''اس نے عرض کیا، اے میرے رب، میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز پکارا مگر میری پکار نے ان کے فرار ہی میں اضافہ کیا اور جب بھی میں نے ان کو

بلایا تاکہ تو انھیں معاف کردے' انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اڑ گئے اور بڑا تکبر کیا''۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ بروج میں جن مومنین کا ذکر کیا ہے انہوں نے اللہ کی راہ میں جان تک دے ڈالی لیکن ان کی زندگی میں ان کی دعوت کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکی۔ اسی طرح قرآن کریم نے ان رسولوں کا ذکر کیا ہے جنھیں اپنے دشمنوں کے ہاتھوں جام شہادت تک نوش کرنا پڑا:

ففریقا کذبتم و فریقا تقتلون۔ (البقرہ۔۸۷) ''کسی کو جھٹلایا' اور کسی کو قتل کر ڈالا''۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلامی تحریکیں ہر خامی سے مبرا ہیں یا یہ کہ وہ تنقید و نصیحت سے بالاتر ہیں جیسا کہ ان تحریکوں کے بعض مخلص پیروکار سمجھتے ہیں کیوں کہ وہ اسلامی تحریکوں اور خود اسلام کو ایک دوسرے کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ان کے نزدیک اسلامی تحریکوں پر نکتہ چینی خود اسلام پر نکتہ چینی کے مرادف ہو جاتی ہے بعض دین مخالف حضرات عملاً ایسا ہی کرتے بھی ہیں کہ اسلامی تحریکوں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے وہ خود اسلام اور اس کے احکام و شریعت پر بھی نکتہ چینی کرنے لگتے ہیں۔

اسلامی تحریکیں انسانی تحریکیں ہی ہیں جو اسلام کو سربلند کرنے اور زندگی میں اس کے پیغام کو برپا کرنے کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں اور ایسے سارے ذرائع و وسائل اختیار کرتی ہیں جنھیں دین کی خدمت کے مقاصد کی تکمیل کے لیے زیادہ مناسب سمجھتی ہیں۔ انہوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ان کی یہ کوشش اور اختیار کردہ راہ وحی پر مبنی ہے جس پر بحث نہیں کی جاسکتی اسی طرح انھیں یہ گمان بھی نہیں ہے کہ ان میں سے کسی کی بات لازماً تسلیم کرنی چاہیے اسے مسترد کیا ہی نہیں

جاسکتا۔ اسی لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اسلامی تحریکوں کے اندر ان اسباب کو تلاش کریں جن کی وجہ سے وہ اسلامی معاشرہ قائم کرنے اور اسلامی عقیدہ و شریعت کی بنیاد پر اسلامی زندگی کو از سرنو زندہ کرنے کی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکیں۔ اس سلسلے میں چند اہم اسباب کا ذکر کروں گا۔

۱۔ خود احتسابی کی کمی

اسلامی تحریکوں کے اندر اہل بصیرت کے سامنے سب سے پہلے یہ شکایت آتی ہے کہ ان میں خود احتسابی اگر مفقود نہیں تب بھی کمزور ضرور ہے۔

خود احتسابی سے مراد اسلامی تعبیر کے مطابق محاسبہ نفس ہے یعنی "نفس لوامہ" پر نظر جس کی طرف قرآن کریم نے توجہ دلائی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ "دانش مند وہ ہے جو خود اپنے آپ پر کڑی نظر ڈالے۔ (ترمذی)

حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ: اپنے نفس کا خود محاسبہ کرو، اس سے پہلے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے اور اپنے اعمال کی خود ناپ تول کرو، اس سے پہلے کہ (تمہارے محاسبہ کے لیے) انھیں ناپا تولا جائے۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ مومن اپنے نفس کا اس سے زیادہ سخت محاسبہ کرتا ہے جتنا کوئی ظالم حاکم یا کنجوس شریک کرتا ہے۔

جس طرح فرد پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق اور بندوں کے حقوق کے تعلق سے اپنی کوتاہیوں پر اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور یہ کوشش کرے کہ اس کا آج کا دن اس کے گزشتہ کل سے بہتر ہو اور اس کا آنے والا کل آج سے بہتر ہو، اسی طرح جماعت پر بھی اپنا محاسبہ کرنے کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس امت کو اس بات سے محفوظ کر رکھا ہے کہ وہ گمراہی پر اکٹھا

ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے کسی بھی جماعت کو غلطی یا گمراہی سے محفوظ نہیں فرمایا ہے خاص طور پر اجتہادی معاملات میں جن میں مختلف نقطہ نظر پیدا ہو جاتے ہیں اور جن میں کسی بھی موقف کے تعلق سے صحیح یا غلط ہونے کا امکان رہتا ہے۔

غلطی اگر اجتہادی ہوتی ہے تو مجتہد کو اس پر تب بھی اجر ملتا ہے چاہے اجتہاد کرنے والا فرد ہو یا جماعت۔ لیکن یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ فتویٰ کے میدان کی طرح عمل کے میدان میں بھی زمان و مکان اور صورت حال کی تبدیلی کے ساتھ اجتہاد بھی بدل جاتا ہے۔

غلطی انسانی کمزوری سے بھی پیدا ہو سکتی ہے اور ایسا ایمان یا تقویٰ کے منافی نہیں کیوں کہ یہ بشریت کے لوازم میں سے ہے' آدمی خطا کا پتلا ہوتا ہے ہم سے کہیں زیادہ مکمل ایمان رکھنے والوں اور اللہ تعالیٰ کے یہاں ہمارے مقابلے میں کہیں زیادہ وزن رکھنے والوں سے بھی کبھی غلطی ہو گئی ہے جیسا کہ غزوۂ احد کے تعلق سے خود قرآن کریم میں ذکر ہے:

او لما اصابتکم مصیبۃ قد اصبتم مثلیھا قلتم انی ھذا قل ھو من عند انفسکم ان اللہ علی کل شئی قدیر۔ (آل عمران - ۱۶۵)

"اور یہ تمہارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آ پڑی' تو تم کہنے لگے یہ کہاں سے آئی' حالاں کہ "جنگ بدر میں" اس سے دوگنی مصیبت تمہارے ہاتھوں "فریق مخالف پر" پڑ چکی ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

اسی طرح قرآن کریم ان کی کمزوری کے لمحات کا ذکر کرتا ہے:

و لقد صدقکم اللہ وعدہ اذ تحسونھم باذنہ حتی اذا فشلتم و تنازعتم فی الامر و عصیتم من بعد ما اراکم ما تحبون منکم من یرید الدنیا و منکم من یرید الاخرۃ ۔ (آل عمران - ۱۵۲)

"اللہ نے "تائید و نصرت کا" جو وعدہ تم سے کیا تھا' وہ تو اس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں اس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا' اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی' جس کی محبت میں تم گرفتار تھے "یعنی مال غنیمت" تم اپنے سردار کی خلاف ورزی کر بیٹھے اس لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے"۔

اس آیت کے نزول کے بعد ایک صحابیؓ نے فرمایا کہ: میں نہیں جانتا تھا کہ ہم میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، جو دنیا کے خواہاں ہیں یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

اسلامی تحریکوں کو چاہیے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنا جائزہ لیتی رہیں اور اپنے وابستگان کی خیرخواہی کی بات کہنے کے لیے---- چاہے وہ تلخ ہی کیوں نہ ہو---- حوصلہ افزائی کرتی رہیں اور اپنے آپ پر تنقید کا حوصلہ دلاتی رہیں چاہے وہ تکلیف دہ ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے:

اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو مجھے میرے عیوب سے آگاہ کرے۔

اسلامی تحریکیں خود انھیں کی ملکیت نہیں ہیں بلکہ پوری امت اسلامیہ کی ملکیت ہیں ساتھ ہی آنے والی اسلامی نسلوں کی بھی ملکیت ہیں۔ ان سب کا یہ حق ہے کہ وہ جان سکیں کہ ان تحریکوں میں طاقت کے پوائنٹ کون سے ہیں اور کمزور پوائنٹ کون سے ہیں تاکہ ان سے سبق سیکھ سکیں۔

اسلامی تحریکوں کے بعض مخلص پیروکار خود تنقیدی کا دروازہ کھولنے سے اس لیے ڈرتے ہیں کہ پھر اس طرح ہر کس و ناکس اور مخلص و بدخواہ کو موقع مل جائے گا کہ وہ جو چاہے کہے اور اس سے اصلاح سے زیادہ بگاڑ پیدا ہوگا۔

یہ بھی ویسا ہی عذر ہے جیسا پہلے کے بعض علماء اختیار کر چکے ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا جائے تاکہ اس میں نام نہاد مدعیان علم اور خام کاروں کو دخل

اندازی کا موقع نہ ملے کہ وہ بغیر علم کے فتویٰ اور حکم صادر کرنے لگیں اور اس طرح خود بھی گمراہ ہوں اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں۔

دونوں صورتوں میں ضروری یہی ہے کہ جو لوگ اہل ہوں ان کے لیے دروازہ کھلا رکھا جائے آخر کار وہی چیز باقی رہ جائے گی جو نفع بخش اور صحیح ہو:

فاما الزبد فیذھب جفاء او اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض۔

(الرعد-۱۷)

"جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے وہ ٹھہر جاتی ہے۔

انھیں یہ بھی اندیشہ محسوس ہوتا ہے کہ اسلامی تحریکوں کے بعض قائدین پر تنقید کہیں ان پر الزام تراشی اور ان کے خلاف ان کے مخالفین کی حمایت کی صورت نہ اختیار کرلے۔ مثلاً ان کے خیال میں کوئی شخص حسن البناء، ابوالاعلیٰ مودودی، سید قطب، مصطفیٰ سباعی یا دوسرے نظریاتی و تحریکی رہ نماؤں میں سے کسی کی کسی رائے پر نکتہ چینی کرتا ہے تو وہ گویا اس پر الزام لگاتا ہے یا اس کی قیادت اور نمایاں شخصیت کو ہدف ملامت بناتا ہے۔

جب کہ کسی فکر و نظریہ پر --- چاہے وہ علمی ہو یا تحریکی---- تنقید کا مطلب علمی، دینی یا اخلاقی اعتبار سے اس نظریہ کے علم بردار کے مرتبہ کو کم کرنا نہیں ہوتا۔

پھر یہ کہ ان شخصیتوں کے نظریات و افکار ان کی ذاتی ملکیت نہیں رہ گئے ہیں بلکہ وہ مسلم نسلوں کی ملکیت ہیں اور یہ ان کا حق---- بلکہ فرض---- ہے کہ وہ جانیں کہ کہاں کہاں اجماع و اتفاق کی صورت ہے اور کہاں کہاں اختلاف کی اور کہاں بات حق سے قریب ہے کہاں دور۔

ان نظریات و افکار کے علم برداروں نے خود بھی کبھی معصوم ہونے کا گمان نہیں کیا نہ اپنے اجتہادات اور رایوں کو تقدس کا رنگ دیا بلکہ حسن البناء نے تو اپنے

"بیس اصولوں" میں صاف طور پر یہ بات دہرائی ہے کہ سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر شخص کی بات مانی بھی جاسکتی ہے اور چھوڑی بھی جاسکتی ہے۔

سید قطب مرحوم نے اپنی سرگرم زندگی کے مختلف مراحل میں اپنا نظریاتی موقف تبدیل کیا۔ پہلے وہ قرآن کریم کی بلاغت و اعجاز بیان سے انتہائی متاثر ادیب و نقاد تھے (جیسا کہ ان کی کتابوں "التصویر الفنی" و "مشاہد القیامہ فی القرآن" سے نمایاں ہے) پھر وہ اسلامی صاحب قلم کی حیثیت میں اسلامی عدالت و انصاف اور اسلامی نظام زندگی کی دعوت دینے لگے (جیسا کہ "العدالۃ الاجتماعیہ و السلام العالمی فی الاسلام" میں نمایاں ہے) پھر وہ ایک تحریکی داعی بن گئے اور معاشرے میں تبدیلی کے سلسلے میں اپنے مخصوص نظریات پیش کرنے لگے اور نظام کے بجائے عقیدہ کی دعوت دینے لگے (جیسا کہ "معالم فی الطریق" اور "تفسیر فی ظلال القرآن" کے دوسرے ایڈیشن سے ظاہر ہے) جب ان کے ایک شاگرد نے ان سے کہا کہ اس طرح تو آپ کے بھی قدیم و جدید دو قول ہو گئے جیسے امام شافعی کے مختلف مسائل میں دو قول مروی ہیں۔ تو انہوں نے جواب دیا: ہاں مگر امام شافعی نے فروعات میں اپنی رائے بدلی تھی۔ میں نے تو بعض اصولوں کے تعلق سے بھی رائے بدلی ہے۔ (دیکھیے مجلّہ الدعوۃ میں ڈاکٹر محمد مہدی بدری کا مقالہ)

کون جانتا ہے کہ تحقیق کرنے والا اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کا قدیم مسلک ہی ---- کم از کم بعض مسائل میں ---- جدید مسلک کے مقابلے میں زیادہ صحیح تھا۔

مولانا مودودی نے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی بعض کتابوں میں لکھی ہوئی تنقید کا خیر مقدم کیا تھا اور اس سے تنگ دلی نہیں محسوس کی تھی جیسا کہ ان کے پیروکاروں نے تنگی محسوس کی۔ مخلص پیروکاروں کو یہ بھی اندیشہ رہتا ہے کہ اسلامی تحریکوں کے مخالف اس خود احتسابی کا ناجائز استعمال کرکے اسے ان تحریکوں اور ان

سے وابستگان میں خلفشار پیدا کرنے کا ذریعہ نہ بنالیں کیوں کہ مخالفین ان کے کمزور پوائنٹ تلاش کر کے انھیں خوب بڑھا چڑھا کر اپنے نقطہ نظر سے پیش کرتے ہیں اور ان کے پس منظر و حالات اور اسباب و محرکات کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔

خود مجھے اس کا ذاتی طور پر تجربہ ہو چکا ہے۔ میں نے جب اسلامی تحریکوں کی اندرونی رکاوٹوں اور کوتاہیوں پر اپنی کتاب "اسلامی حل" میں کچھ لکھا تو بائیں بازو کی طرف رجحان رکھنے والے بعض حضرات نے اس میں بعض چیزیں حذف اور آگے پیچھے کر کے انھیں اپنے انداز میں پیش کیا جیسے کسی بدمست شاعر نے قرآن کریم کی اس آیت کو کہ بربادی ہو ان نمازیوں کے لیے جو نماز سے غافل ہو جاتے ہیں اس انداز میں پیش کیا تھا کہ قرآن نے غافل ہونے والوں کی بربادی کی نہیں بلکہ نمازیوں کی بربادی کی خبر دی ہے۔

لیکن اس کے باوجود یہ جائز و مناسب نہیں ہوگا کہ اس طرح کی تحریف یا ناجائز استعمال کے اندیشے کے پیش نظر مخلصانہ علمی تنقید کو بھی روکا جائے۔ باطل کے ڈر سے حق بات کو چھپایا نہیں جانا چاہیے۔ لوگ تو اللہ تعالیٰ کے کلام کو بھی غلط معنی پہنانے کی کوشش کر چکے ہیں لیکن کلام الٰہی بدستور روشنی و ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ ہم انسانوں کی بات اس سے زیادہ حفاظت کے لائق تو نہیں ہو سکتی۔

۲۔ اختلاف اور پھوٹ

عصر حاضر کی اسلامی تحریکوں کی ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ متعدد جماعتوں کے درمیان پھوٹ اور اختلاف نظر آتا ہے۔ ہر جماعت یہ سمجھتی ہے کہ وہی تنہا مسلمانوں کی جماعت ہے۔ اپنے آپ کو مسلمانوں کی ایک جماعت نہیں سمجھتی۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی سمجھتی ہے کہ حق تمام تر اسی کے ساتھ ہے اور اس کے بعد صرف گمراہی باقی رہ

جاتی ہے۔ اسی طرح جنت اور نجات بس اس کے پیروکاروں کی جاگیر ہے اور وہی تنہا نجات یافتہ گروہ ہیں ان کے علاوہ سب ہلاکت و بربادی کا شکار ہونے والے ہیں۔ ان میں سے جو زبان سے ایسا نہیں کہتا وہ زبان حال سے یعنی عملاً ایسا ہی کہتا ہے گویا امت میں پھوٹ اور انتشار اسلامی تحریکوں میں بھی سرایت کرگیا ہے۔ اسلامی عمل کی کامیابی اور اسے صحیح راستے پر گامزن رکھنے کے خواہش مند مخلصین اس چیز سے نالاں رہتے ہیں۔ اگر ان جماعتوں کا نظریاتی موقف ایسا ہی رہا تو یہ شکایت برقرار رہے گی اور ان کے درمیان باہم حقیقی قربت کی راہ نہیں نکل پائے گی۔

میں یہاں "قربت" کا لفظ استعمال کررہا ہوں "وحدت" کا نہیں۔ کیوں کہ میں اس کے خلاف نہیں ہوں کہ اسلام کے لیے کام کرنے والی متعدد جماعتیں ہوں۔ نہ میری یہ خواہش ہے کہ سب لوگ ایک ہی جماعت و تنظیم میں ایک ہی قیادت کے تحت ضم ہو جائیں۔ یہ ایک خوب صورت خواب تو ہو سکتا ہے لیکن اس کے شرمندۂ تعبیر ہونے کی راہ میں سخت دشواریاں حائل ہیں سوائے اس کے کہ انسان فرشتے بن جائیں۔

پھر متعدد جماعتوں کے وجود سے کوئی نقصان بھی نہیں ہو سکتا اگر وہ مختلف نوع کے کام کریں باہم تضاد اور ٹکراؤ کی صورت نہ پیدا ہو۔

کوئی جماعت عقیدہ کو شرک و خرافات سے آزاد کرانے اور کتاب و سنت کے مطابق مسلمانوں کے عقائد درست کرنے کے میدان میں سرگرم عمل ہو۔

کوئی جماعت عبادات کی درستی اور بدعات سے پاک کرنے کے میدان میں جدوجہد کرے اور لوگوں میں دین کی سمجھ پیدا کرے۔ کوئی جماعت خاندان اور عورتوں کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرے اور شرعی پردے کی طرف دعوت دے اور بے حیائی و انحراف سے روکے۔

کوئی جماعت سیاسی میدان میں سرگرم کار ہو اور انتخابات میں حصہ لے کر

نظریاتی مخالفین کا مقابلہ کرے۔

کوئی جماعت تربیت اور سماجی کام کے میدان کو اپنی جولان گاہ بنائے اور اس میں جدوجہد کرے۔

کوئی جماعت ان سارے میدانوں میں یا کچھ میدانوں میں اپنی صلاحیت اور وسائل کے مطابق حصہ لے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی جماعت عوام میں کام کرے اور کوئی دوسری جماعت پڑھے لکھے لوگوں میں۔ پہلی جماعت کے لوگوں کو عوام کے ایمانی جذبات و احساسات سے اپیل کرنی ہوگی دوسری جماعت کے لوگوں کو خواص کے افکار و اذہان سے۔ خاص طور پر ان لوگوں کے ذہنوں کے دروازے کھولنے ہوں گے جو مغربی تہذیب کے مختلف پہلوؤں سے متاثر اور ان کے فریب خوردہ ہیں۔

اس طرح متعدد جماعتیں ہو سکتی ہیں اور ان کی دلچسپیوں کے مطابق کام کی نوعیت بھی مختلف ہو سکتی ہے ہاں اتنا ضرور ہونا چاہیے کہ جو بھی جو کام ہاتھ میں لے اسے اچھے انداز سے انجام دے۔

پھوٹ کا سبب کبھی یہ بھی بن جاتا ہے کہ اسلامی کارکنوں کے اتحاد کی انتہائی خواہش و کوشش کی جاتی ہے یعنی یہ کہ ساری دنیا میں ایک ہی عالمی اسلامی تحریک ہو۔ اب جو اپنے نقطہ نظر سے کوئی دوسرا طریق کار یا تحریک اختیار کرتا ہے اس پر پھوٹ ڈالنے اور اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کا الزام لگادیا جاتا ہے جب کہ اس طرح کے الزامات سے اور پھوٹ پڑتی ہے اور دلوں میں مزید دوری پیدا ہوتی ہے اس طرح اتحاد کی مبالغہ آمیز خواہش پھوٹ کا سبب بن جاتی ہے۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ نقطہ ہائے نظر پر مقاصد کی ترتیب، وسائل کی تاثیر، ترجیحات قائم کرنے اور معاون چیزوں اور رکاوٹوں کا اندازہ کرنے

میں اختلاف رائے کی بنیاد پر طریق کار اور طرز فکر میں تنوع کو تسلیم کیا جائے اور یہ اعتراف کیا جائے کہ صورت حال اور زمان و مکان کی تبدیلی کے ساتھ اجتہاد اور فتوئی بھی بدلتا ہے اور ہر کوشش کرنے والے کو اجر ملے گا اور ہر آدمی کو اسی کا اجر ملے گا جس کی اس نے نیت کی تھی۔

یہ چیز مفید و بہتر ہے بشرطے کہ سبھی لوگ ایک دوسرے سے حسن ظن رکھیں' اختلاف کے مواقع پر درگزر سے کام لیں' بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون اور خیرخواہی کریں اور اسلامی وجود اور اس کے مستقبل پر اثرانداز ہونے والے بڑے مسائل میں ایک صف کی طرح متحد ہو جائیں' یہودیت و مسیحیت و اشتراکیت وغیرہ مشترکہ دشمنوں کا سامنا متحد ہو کر کریں اور اللہ تعالٰی کا یہ قول پیش نظر رکھیں کہ:

ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا کانھم بنیان مرصوص۔ (الصف ـ ۴)

"اللہ کو تو پسند وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح صف بند ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی دیوار ہیں"۔

آج اسلامی تحریکوں کے رہ نماؤں کی ذمے داری ہے کہ وہ اسلام کے لیے سرگرم کار جماعتوں کے درمیان قربت و ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ عرب ممالک میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد جن جماعتوں کی پرجوش حامی ہے ان میں خاص طور پر قابل ذکر جماعتیں یہ ہیں۔

----اخوان المسلمین

----جماعۃ السلفیین

----جماعۃ الجہاد

----حزب التحریر الاسلامی

---- تبلیغی جماعت

اسی طرح دیگر مسلم ممالک میں بھی کچھ جماعتیں سرگرم ہیں مثلاً ہندوپاک میں جماعت اسلامی' ترکی میں سلامت پارٹی اور جماعت نور یمین اور ملیشیا میں مسلم نوجوانوں کی جماعت اور اسلامی پارٹی وغیرہ وغیرہ۔

ان جماعتوں کے رہ نماؤں اور مفکرین کو چاہیے کہ وہ ایسے سیمناروں وغیرہ میں اکٹھا ہوں جہاں ان باتوں کو نمایاں کیا جائے جن پر اتفاق رائے ہے اور جن میں باہم تعاون ضروری ہے۔ اسی طرح اختلاف کی چیزوں میں شدت میں کمی لائی جائے اور جزدی باتوں میں لاطائل بحث و مباحثہ ختم کرایا جائے کیوں کہ اس طرح کی چیزیں ختم نہیں ہوسکتیں' رائے اور عمل میں اختلاف رائے کرنے والوں کے درمیان ایک دوسرے کے تعلق سے حسن ظن پیدا کیا جائے اور اس طرح کے فیصلے کیے جائیں جن پر سب کو متفق کیا جاسکتا ہو اور سب مل کر دشمنان اسلام کے خلاف' جو بہت زیادہ بہت طاقت ور اور بہت گہری چالیں چلنے والے ہیں' متحدہ موقف اختیار کریں۔

میرے خیال میں یہ غلطی ہوگی کہ ان جماعتوں کے درمیان خلیج اور اختلاف کو بڑھانے کی کوشش کی جائے جب کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے میں سرگرم ہیں بلکہ ضروری یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ان کے درمیان خلیج اور دوری کو کم کیا جائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ وہ بیس اصول جو حسن البناء نے نہایت حکمت و اعتدال کے ساتھ تیار کیے تھے اور جنھیں اسلام کے لیے سرگرم کار لوگوں کے درمیان فکری ہم آہنگی کی بنیاد بنا کر مصر میں دینی جماعتوں کے باہمی اتحاد عمل کے لیے پیش کیا تھا تاکہ وہ ان کی بنیاد پر باہم اکٹھا ہوں اور افتراق اور الزام تراشی سے کنارہ کشی اختیار کریں' اب بھی دینی جماعتوں کے فکری اتحاد و یگانگت کی بنیاد بن سکتے ہیں بشرطے کہ نیتیں

درست ہوں۔

اس کے ساتھ ہی علامہ رشید رضا (مدیر المنار) کے اس مشہور سنہری اصول کو بھی ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ "ہم جس بات پر متفق ہیں اس میں ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں اور جس بات میں اختلاف رائے ہوتا ہے اس میں ایک دوسرے کو معذور سمجھتے ہیں (یعنی درگزر کرتے ہیں)" میں نے حسن البناء سے زیادہ اسلامی جماعتوں کے درمیان ہم آہنگی و قربت پیدا کرنے کی تڑپ کم ہی دیکھی ہے وہ مختلف مواقع پر اس سلسلے میں زور دیتے رہتے تھے اور دلوں تک رسائی کے لیے نرم ترین اسلوب اختیار کرتے تھے۔ "چھٹی کانفرنس کا پیغام" میں لکھتے ہیں "تمام اسلامی تنظیموں اور اداروں کے تعلق سے' ان کے رجحانات میں اختلاف کے باوجود' ہمارا موقف محبت' اخوت' تعاون اور دوستی کا ہے۔ ہم ان سے محبت کرتے ہیں' ان سے تعاون کرتے ہیں۔ مختلف نقطہ ہائے نظر کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی سخت جدوجہد کرتے ہیں اور مختلف مکاتب فکر کے درمیان اس طرح ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے حق کو' تعاون و محبت کے سائے میں کامیابی حاصل ہو اور ہمارے درمیان کوئی فقہی رائے یا مسلکی اختلاف دوری نہ پیدا کرسکے۔ اللہ کا دین آسان ہے اور جو بھی دین کے سلسلے میں تشدد برتے گا' مغلوب ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں مثالی طرز عمل کی توفیق عطا کی ہے یعنی یہ کہ ہم ایسے نرم انداز میں حق کی جستجو کریں جس سے دلوں کو کشش محسوس ہو اور ذہن مطمئن ہوں۔ ہمیں یقین ہے کہ عن قریب وہ دن آئے گا جب ظاہری اختلافات کی مختلف شکلیں ناپید ہوجائیں گی اور نظریاتی رکاوٹیں دور ہوجائیں گی اور ان کی جگہ عملی اتحاد لے لے گا جس سے اسلامی صفیں باہم اکٹھا ہوسکیں گی اور دین کے لیے سرگرم اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے مسلمان بھائی ہی نظر آئیں گے۔

و من يتول الله و رسوله و الذين امنوا فان حزب الله هم الغالبون۔

(المائدہ-۵۶)

"اور جو اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنالے' اسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے"۔

اسلامی تحریکوں کو یہ نہیں کرنا چاہیے کہ دعوت اسلام کے میدان میں کام کرنے والی طاقت ور اور موثر شخصیات کو نظرانداز کردیں کیوں کہ یہ شخصیتیں اگرچہ انفرادی طور پر کام کر رہی ہوں اپنے اپنے دائروں میں ان کا اثر ہوتا ہے۔ ان کے شاگرد اور مرید ہوتے ہیں اور ان کا اپنا اپنا مکتب فکر ہوتا ہے۔ بلاشبہ ان میں سچے اور مخلص لوگ بھی ہوتے ہیں جو رائے عامہ کو ہموار کرسکتے ہیں اور انھیں ایک رخ دے سکتے ہیں اگر وہ صحیح رخ پر اور درست عزم سے کام لیں۔

ایک منصوبہ بند اور منظم اجتماعی کام کی ہماری دعوت کا مطلب یہ نہیں ہوسکتا کہ جو لوگ اجتماعی دائروں سے باہر رہ کر کام کر رہے ہیں ہم ان کا اعتبار ساقط کردیں ان میں سے کسی کے پاس کوئی عذر ہوسکتا ہے یا کوئی مادی یا اخلاقی رکاوٹ ہوسکتی ہے جو اسے منظم اجتماعی کام نہ کرنے دیتی ہو اگرچہ اس کے لیے بھی یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ اور اپنی کوشش سے ہر ایسے اجتماعی کام میں مددگار ہو جو اسلامی شریعت کے مطابق ہو خواہ وہ باضابطہ طور پر اس کا ممبر نہ بنے۔

مثلاً کچھ پاک باز اور دعوت اسلام کے مخلص لوگ وزارت اوقاف و دینی امور اور یونیورسٹیوں اور اکیڈمیوں وغیرہ سرکاری اداروں میں کام کرتے ہیں۔ محض ان کے سرکاری ربط کی وجہ سے انھیں نظرانداز کرنا مناسب نہیں ہوگا وہ اپنے اداروں اور وسائل کے ذریعہ اسلام کی گراں قدر خدمات انجام دے سکتے ہیں۔

۳- عقلی و علمی رجحان پر جذباتی رجحان کا غلبہ

اسلامی تحریکوں کی ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ عقلی و علمی پہلو پر جذباتی پہلو غالب آجاتا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ جذباتی پہلو کو یکسر کالعدم قرار دے دیا جائے اور محض عقلی پہلو کو بنیاد بنایا جائے اور جذبات و احساسات کو دور دور رکھا جائے۔ ایسا کرنا تحریکوں کے مزاج کے بھی خلاف ہوگا اور خود اسلام کے مزاج کے خلاف بھی۔

اسلام عقل کے احترام اور غور و فکر کی دعوت دینے کے باوجود محض ایک ٹھوس منطقی و عقلی فلسفہ کا نام نہیں بلکہ وہ اپنی تعلیمات میں جذباتی پہلو بھی شامل رکھتا ہے اور اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مثلاً اللہ کے لیے محبت اور اس کے لیے نفرت' اللہ کی عطا کردہ توفیق پر مسرت و خوشی اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی صادر ہو جانے پر رنج و غم' خوف و امید اور دیگر نفسیاتی حالتیں جن کو اہل تصوف نے اپنی کتابوں میں خاص طور پر بیان کر رکھا ہے جیسا کہ حضرت ہروی کی کتاب "منازل السائرین" اور امام ابن قیم کی لکھی ہوئی اس کی شرح "مدارج السالکین" وغیرہ میں نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

اس پہلو میں کوئی اختلاف نہیں' نہ بحث کی ضرورت ہے کیوں کہ اسلام انسان کی عقل اور اس کے دل کو ساتھ ساتھ مخاطب کرتا ہے۔ اس لیے اس نے ان لوگوں کی بھی مذمت کی ہے جو عقل و فہم سے کام نہیں لیتے ساتھ ہی ان لوگوں کو بھی ہدف ملامت بنایا ہے جن کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کے نازل کردہ حق سے ڈرتے نہیں۔ اس طرح اسلام عقلی اور جذباتی دونوں پہلوؤں پر توجہ دیتا ہے' ایک متفق علیہ حدیث میں آتا ہے:

"جس میں تین باتیں ہوں اس نے ایمان کی حلاوت پالی۔ یہ کہ اللہ اور اس کا

رسول اس کے نزدیک ہر چیز سے زیادہ محبوب ہوں' آدمی کسی سے صرف اللہ کے لیے محبت کرے اور یہ کہ وہ پھر کفر کی حالت میں لوٹ جائے---اس کے بعد کہ اللہ تعالی نے اسے اس سے بچالیا تھا----یہ بات اسے اس سے زیادہ ناپسند ہو کہ اسے آگ میں ڈال دیا جائے۔"

اسلامی تحریک کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ وہ ایمانی احساسات کو زندہ کرنے اور اسلامی جذبات کو بیدار کرنے کو اسلام کے پیغام کا ایک جز سمجھتی ہے۔ اور تحریک کو کسی قدر پرجوش بنانے کے لیے یہ پہلو ناگزیر ہے جو اسے سرگرم ہونے اور خرچ کرنے نیز دلوں کو محبت و اخوت سے اس طرح جوڑنے پر آمادہ کرتا ہے جو بالآخر اسے ایثار کے درجے تک پہنچادے۔

جس اسلامی جماعت سے اسلام کی مدد کی توقع کی جاتی ہے اس کی بنیاد جس طرح تنظیمی و نظریاتی وحدت پر قائم ہوتی ہے اسی طرح احساسات و جذبات کی وحدت پر بھی ہوتی ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر دلوں کو جوڑنے اور اللہ کے لیے محبت کی رسی سے باندھنے کی بنیاد پر۔ اور یہ اتنی اہم بات ہے کہ اللہ تعالی نے اپنے رسول پر اس نعمت کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے:

هو الذی ایدک بنصره و بالمومنين و الف بين قلوبهم لو انفقت ما فی الارض جميعا ما الفت بين قلوبهم و لكن الله الف بينهم انه عزيز حكيم۔

(الانفال-۶۲-۶۳)

شہید حسن البناء اپنی ہفتہ وار گفتگو میں جو "منگل کی گفتگو" کے نام سے مشہور ہوئی' اس بات کی کوشش کیا کرتے تھے کہ ایمان و محبت سے دلوں کو زندہ کرنے والی باتوں سے آغاز کریں اور اسے وہ "منگل کا جذبہ" نام دیا کرتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے اخوت کو بیعت کے اہم ارکان میں شامل کیا تھا اور فرمایا کرتے تھے کہ ہماری

دعوت کی عمارت تین ستونوں پر قائم ہے۔ گہری سمجھ، گہرا ایمان اور مضبوط محبت۔

یہ ہے جذبات کی جگہ اور اہمیت اسلامی تعلیمات میں اور اسلامی تحریکات میں۔ جذباتیت کے غلبے سے ہماری مراد یہ ہے کہ تعلقات و تصرفات اور فکر و طرز عمل پر جذبات کا غلبہ و تسلط نہ ہو اور جذبات، اقوال و اعمال نیز اشخاص، اداروں اور مسائل کے تعلق سے موقف اختیار کرنے میں فیصلہ کن نہ بن جائیں کیوں کہ اس طرح جذباتیت عقل سے بالاتر ہو جائے گی اور علم سے پہلے خواہش کو اہمیت دی جانے لگے گی۔

عقل و علم پر جذباتیت کو غالب کرنے کے کا یہ پہلو متعدد صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہاں ہم صرف چند صورتیں بطور مثال پیش کریں گے:

مطالعہ و منصوبہ بندی میں کوتاہی

اس کے باوجود کہ اسلام عقل و علم کی دعوت دیتا ہے اور مسلمان کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ اسباب و علل اور قوانین فطرت کا احترام کریں، نیز پوری احتیاط کے ساتھ آنے والے کل کے لیے تیاری کریں، ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی تحریکیں اس پہلو پر کم ہی زور دیتی ہیں۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک دن میں نے ایک سرکردہ داعی کے سامنے اعداد و شمار اور حقائق کے مطالعہ کی بنیاد پر منصوبہ بندی کی ضرورت کا اظہار کیا تو انہوں نے جوب دیا کہ "کیا اللہ کی طرف دعوت اور لوگوں کو اسلام کے بارے میں یاد دلانے کے لیے بھی اعداد و شمار اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہو سکتی ہے؟"

جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ ہجرت کرنے کے بعد کلمہ گو حضرات کی تعداد تیار کرنے کی ہدایت فرمائی تھی اور شمار کرنے کے بعد ان کی تعداد پندرہ سو نکلی تھی جیسا کہ بخاری و مسلم کی روایت میں موجود ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پوری باریک بینی کے ساتھ یہ جاننا چاہتے تھے کہ ان کے پاس کتنی افرادی قوت ہے تاکہ آپؐ کے اندازے اور فیصلے پوری جان کاری کی بنیاد پر ہوں۔

لہٰذا امت اسلامیہ اور اسلامی تحریکوں سے متعلق حقائق نیز اسلام دشمن طاقتوں سے متعلق حقائق کا مطالعہ اور اس سلسلے میں تمام ضروری معلومات کو اکٹھا کرنا، ان کا معروضی انداز میں علمی تجزیہ کرنا اور لازمی نتائج حاصل کرنا ناگزیر ہے تاکہ مثبت طور پر انھیں کام میں لایا جاسکے۔

اسلامی عمل سے منسوب بعض لوگ اب بھی اس بات سے تنگ دلی محسوس کرتے ہیں کہ ان سے یہ کہا جائے کہ پہلے تمام حقائق کا مطالعہ ضروری ہے۔ کسی بھی نظریہ یا اسکیم کے مطالعہ کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہوتا ہے کہ اسے آہستہ آہستہ نظرانداز کردیا جائے۔

ہم جب یہ مطالبہ کرتے تھے کہ جس طرح ماہرین اقتصادیات کسی اسکیم کے قابل عمل ہونے کا جائزہ لیتے ہیں اسی طرح ہم بھی مطالعہ و تحقیق کریں تو ہمارے ایک دوست کہہ اٹھتے تھے کہ اہم بات یہ ہے کہ پہلے ہم کام شروع کردیں اور بلاتوقف کرتے چلے جائیں ناقص کام میں کوئی حرج نہیں۔ ہم کام شروع کردیں چاہے وہ ناقص یا غلط ہی ہو پھر کوئی بعد میں آنے والا اس کا نقص دور کردے گا یا غلطی کی اصلاح کردے گا۔

اس طرز فکر کے بھی کچھ محرکات ہیں لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ کسی غلط کام کو صحیح رخ پر لانا اور کسی ناقص اسکیم کی اصلاح کرنا اسے صحیح خطوط پر شروع کرنے سے کہیں زیادہ دشوار ہوتا ہے۔

مخلص لوگ اصلاح کی انتھک کوشش کرتے ہیں لیکن اس کے خاطرخواہ نتائج نہیں

نکلتے۔ کبھی کبھی کچھ اصلاح ہو بھی جاتی ہے لیکن بہت سے بگڑے معاملات کی اصلاح بعد میں ممکن ہی نہیں ہوتی کیوں کہ وہ شروع ہی سے غلط راہ پر پڑ چکے ہوتے ہیں۔

جن چیزوں کی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ نوجوان کی صلاحیتوں کو اعلیٰ سطح پر مہارت پیدا کرنے پر لگایا جائے سائنسی' شرعی' سیاسی' اقتصادی' سماجی' ثقافتی' تربیتی و انتظامی اور ذرائع ابلاغ وغیرہ ان تمام میدانوں میں جو جدید دور یعنی کمپیوٹر' ایٹم اور فضا کی تسخیر وغیرہ کے عہد میں ایک مہذب جدید معاشرے کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ آج دنیا میں روزانہ سائنس و ٹکنالوجی کے میدانوں میں نئی نئی ایجادات و اختراعات سامنے آ رہی ہیں جب کہ مسلمان باہم کش مکش آرائی میں مشغول ہیں' کھلواڑ اور لہو ولعب میں منہمک ہیں یا بے فائدہ باتوں میں وقت گنوا رہے ہیں۔

امت پر اجتماعی طور پر جو فرض کفایہ شریعت عائد کرتی ہے ان میں مہارت پیدا کرنا ناگزیر ہے یہ جائز نہیں کہ ساری صلاحیتیں کسی ایک میدان میں جھونک دی جائیں اور دوسرے میدانوں پر کوئی توجہ دینے والا ہی نہ ہو۔

خود نبوت کے دور میں قرآن کریم مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کرچکا ہے کہ تمام لوگوں کو جہاد ہی میں مشغول نہیں ہونا چاہیے جب کہ جہاد کا مرتبہ اور فضیلت مسلم ہے اور دوسرے میدان سے' جو کم اہمیت نہیں رکھتا یعنی دین کی سمجھ' غافل نہیں ہو جانا چاہیے:

و ما کان المومنون لینفروا کافتہ فلولا نفر من کل فرقتہ منھم طائفتہ لیتفقھوا فی الدین و لینذر قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون۔ (التوبہ۔ ۱۲۲)

"اور یہ کچھ ضروری نہ تھا کہ اہل ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے' مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے

اور دین کی سمجھ پیدا کرتے' اور واپس جاکر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ "غیر مسلمانہ روش سے" پرہیز کرتے"۔

چوں کہ ہم منصوبے کے بغیر کام کرتے ہیں اور ہمارے مخالفین منصوبے بناتے ہیں اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ہماری جدوجہد کے ثمرات بھی اچک لیتے ہیں اور ہم غافل رہ جاتے ہیں۔

تمام مغربی و مشرقی و صیہونی استعماروں کے خلاف آزاری کی تحریکوں کا سرچشمہ' محرک اور رہ نما اسلام رہا ہے جس کا اعتراف مشرق و مغرب کے غیر جانب دار مبصرین اور انصاف پسند مورخ بھی کرتے ہیں لیکن افسوس ناک بات یہ ہوئی کہ اسلام اپنی بوئی فصل نہیں کاٹ سکا بلکہ اس کے مخالفین جو گھات لگائے آرام سے انتظار کر رہے تھے فصل پکتے ہی اچانک آگے آگئے اور اس منصوبہ بندی سے صورت حال کو اپنے حق میں موڑ لیا کہ سب لوگ انھیں کی طرف دیکھنے لگے اس طرح تنہا انھوں نے جنگ آزادی کی فتح یابی کے ثمرات اچک لیے۔

ایسے لوگ بسا اوقات اسلامی ہیئت بھی اختیار کر لیتے ہیں اور زبان سے اس کی ترجمانی بھی کرنے لگتے ہیں جب کہ ان کے دل اسلام سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ سادہ لوح مسلمان ان کی ہیئت اور ان کی باتوں سے دھوکا کھا جاتے ہیں اور انھیں کارآمد و مخلص سمجھنے لگتے ہیں اور اس ترکیب سے جب وہ زمام اقتدار پر قابض ہو جاتے ہیں تو اپنے اصل چہرے دکھانے لگتے ہیں اور اس اسلام سے براءت ظاہر کرنے لگتے ہیں جس کے نام پر اور جس کے بل پر وہ اس پوزیشن پر پہنچے تھے۔

کمال اتاترک کے ساتھ یہی ہوا۔ اس نے اسلام کے نام پر اور اسی کے جھنڈے کے نیچے ترک قوم کی رہ نمائی کی۔ قوم نے جان و مال سے اس کا ساتھ دیا یہاں تک کہ اسے کامیابی حاصل ہو گئی۔ پورے عالم اسلام میں اس کا خیر مقدم کیا گیا

اور لوگوں نے "غازی" مصطفیٰ کمال کے نعرے لگائے۔ مشہور عربی شاعر احمد شوقی نے اپنے مشہور قصیدے میں اسے یوں خراج تحسین پیش کیا :

"اللہ اکبر یہ فتح یابی کتنی عجیب و غریب ہے۔

اے ترکوں کے خالد عربوں کے خالد کو بھی از سر نو زندہ کر"۔

ابھی لوگ فتح یابی کا جشن ہی منا رہے تھے کہ شادی ماتم میں بدل گئی۔ "غازی" جسے لوگ اسلام کی تلوار سمجھ رہے تھے اچانک اس کی پیٹھ میں گھونپا گیا زہر آلود چھرا بن گیا اور اس نے خلافت ہی کو کالعدم قرار دے کر پورے اسلام ہی کو مسلمان ترک قوم کے اجتماعی وجود سے خارج کر دینے کی مہم شروع کر دی۔

یہ ایسا اچانک زبردست صدمہ تھا جس نے مشرق سے لے کر مغرب تک پورے عالم اسلام کو ہلا کر رکھ دیا یہاں تک کہ احمد شوقی کو خلافت کا مرثیہ کہنا پڑا۔

شادی کے شادیانے ماتم کی دھنوں میں تبدیل ہو گئے
خوشیوں کے بیچ خلافت کی موت کی خبر ملی
خلافت کو سہاگ رات ہی میں کفن پہنا دیا گیا
اور صبح ہونے سے پہلے ہی اسے دفن کر دیا گیا۔

۴۔ جلد بازی

جلد بازی بھی عقل و علم اور منصوبہ بندی کی منطق پر جذباتیت کے غلبے کے مظاہر میں سے ہے۔ جلد باز صبر و تحمل سے کام نہیں لے سکتا وہ چاہتا ہے کہ آج بوئے تو کل ہی فصل کاٹ لے۔ بلکہ وہ صبح کو بو کر شام ہی کو فصل کاٹنا چاہتا ہے جب کہ یہ کائنات اور انسانی معاشرے میں اللہ تعالیٰ کی سنت اور قوانین کے خلاف ہے۔ ہر چیز کا وقت اور طریقہ مقرر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تخلیق چھ دنوں میں فرمائی جب کہ وہ قدرت رکھتا تھا کہ کہہ دے کن (ہو جا) اور وہ ہو جاتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم کو صبر و تحمل سے کام لینے کی تعلیم دی۔

اللہ تعالیٰ قدرت رکھتا تھا کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھ والے اہل ایمان کی شروع ہی میں مدد کردے لیکن اس نے حضرت نوح علیہ السلام کو چھوڑ دیا کہ وہ رات و دن اور بہ آواز بلند اور چپکے چپکے ساڑھے نو سو برس تک دعوت دیتے رہیں۔ پھر انھیں اس سفینہ کے ذریعہ نجات دی جسے انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا، آسمان سے نہیں اتارا گیا۔

اللہ تعالیٰ قدرت رکھتا تھا کہ وہ دعوت کے آغاز ہی میں اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کردے اور آپؐ کے دشمنوں کو اوپر یا نیچے سے عذاب بھیج کر تباہ و برباد کردے اور آپؐ اور آپؐ کے ساتھی فتنہ و آزمائش میں نہ مبتلا ہوں۔

بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو انھیں سرکش طاقت کے مقابلے میں جہاد اور اپنا دفاع کرنے کی بھی شروع میں اجازت نہیں دی اور فرمایا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو، یہاں تک کہ اہل ایمان کو ٹھکانا اور طاقت حاصل ہو گئی تب انھیں جنگ کی اجازت دی گئی جب کہ اللہ تعالیٰ ان کی نصرت و مدد پر پوری طرح قدرت رکھتا تھا۔

اور اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور آپؐ کے ساتھی مومنین کو صبر کرنے اور جلد بازی سے کام نہ لینے کا حکم دیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ صادر کردے:

فاصبر کما صبر اولو العزم من الرسل و لا تستعجل لهم۔ (الاحقاف-۳۵)

"پس اے نبیؐ، صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے، اور ان کے معاملے میں جلدی نہ کرو"۔

فاصبر ان وعد اللہ حق و لا یستخفنک الذین لا یوقنون۔ (الروم-٦٠)

"پس "اے نبیؐ" صبر کرو' یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے' اور ہرگز ہلکا نہ پائیں تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے"۔

و اصبر و ما صبرک الا باللہ و لا تحزن علیھم و لا تک فی ضیق مما یمکرون۔ (النحل-١٢٧)

"اے نبی صبر سے کام کیے جاؤ اور تمہارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔ ان لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو' اور نہ ان کی چال بازیوں پر تنگ دل ہو"۔

یا ایھا الذین امنوا اصبروا و صابروا و رابطوا و اتقو اللہ لعلکم تفلحون۔

(آل عمران-٢٠٠)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' صبر سے کام لو' باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ۔ حق کی خدمت کے لیے کمربستہ ، ہو اور اللہ سے ڈرتے رہو' امید ہے کہ فلاح پاؤ گے"۔

جلد بازی ہی نے اسلامی تحریکوں کو کئی معرکوں میں وقت سے پہلے اور کئی ایسے معرکوں میں کودنے پر آمادہ کیا جو ان کی طاقت سے کہیں زیادہ بڑے تھے۔ اسی طرح مشرق و مغرب کے ساتھ ایک ساتھ جنگ چھیڑنے اور ایسی جگہوں میں گھس جانے پر آمادہ کیا جن سے نکلنے کی وہ صلاحیت نہیں رکھتی تھیں۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہماری طاقت کے مطابق ہی مکلف بنایا ہے۔ ہمارے لیے یہ جائز نہیں کہ اپنے آپ کو ایسی آزمائش میں ڈال دیں جنھیں ہم جھیل نہیں سکتے اور اس طرح فتنہ میں پڑ جائیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فاتقوا اللہ ما استطعتم۔ لہٰذا جہاں تک تمہارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"جب میں تمہیں کوئی حکم دوں تو جتنا کر سکو اتنا ہی بجالاؤ"۔

اسی طرح فرمایا:

"تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے' اور جو ایسا نہ کر سکے وہ اپنی زبان سے روک تھام کرے اور جو یہ بھی نہ کر سکے وہ اپنے دل ہی میں اسے برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے"۔

گویا آپؐ نے برائی کی روک تھام کے لیے انسان کی صلاحیت و طاقت کے مطابق مختلف درجات قائم کیے اور مسلمان کے لیے کوئی حرج نہیں کہ وہ جتنا کر سکے کرے اور جو نہ کر سکے اسے چھوڑ دے۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جلد بازی کی مذمت کی ہے کیوں کہ اس کا نتیجہ برا نکلتا ہے قرآن کریم کے اشارات سے جلد بازی --- چاہے بہترین مقصد ہی کے لیے کیوں نہ ہو --- کی برائی واضح ہوتی ہے:

و ما اعجلک عن قومک یا موسی قال هم اولاء علی اثری و عجلت الیک رب لترضی۔ قال فانا قد فتنا قومک من بعدک و اضلهم السامری۔

(طہٰ-۸۳'۸۵)

"اور کیا چیز تمہیں اپنی قوم سے پہلے لے آئی موسیٰ! اس نے عرض کیا' وہ بس میرے پیچھے آرہی ہے میں جلدی کر کے تیرے حضور آگیا ہوں اے میرے رب تا کہ تو مجھ سے خوش ہو جائے۔ فرمایا۔ اچھا تو سنو' ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا ہے اور سامری نے انہیں گمراہ کر ڈالا۔"

علامہ آلوسی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ گویا اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ (اے موسیٰ) تمہیں اپنی قوم کے تعلق سے جلد بازی نہیں کرنی چاہیے تھی اور کسی بھی صورت میں ان کے معاملے کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے تھا کیوں کہ وہ ابھی نئے

نئے تمہارے پیروکار ہوئے ہیں اور اتنے سادہ لوح اور کم عقل ہیں کہ شیطان انھیں اپنے مکر و فریب کا نشانہ بنا کر گمراہ کر سکتا ہے۔ (روح المعانی جلد۶' صفحہ ۲۴۲)

اور جب حضرت موسی علیہ السلام اپنی قوم میں واپس آئے اور ان کی بچھڑے کو پوجنے والی بدعت سے سخت برافروختہ ہو کر اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کا سر پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا تو انہوں نے کہا:

قال یا هارون ما منعک اذ رایتهم ضلوا الا تتبعن افعصیت امری قال یا ابن ام لا تاخذ بلحیتی و لا براسی انی خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل و لم ترقب قولی

(طہ ۹۲-۹۴)

"موسی "اہل قوم کو ڈانٹنے کے بعد ہارون کی طرف پلٹا اور" بولا ہارون جب تم نے دیکھا تھا کہ یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو کس چیز نے تمہارا ہاتھ پکڑا تھا کہ میرے طریقے پر عمل نہ کرو؟ کیا تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی؟ ہارون نے جواب دیا! اے میری ماں کے بیٹے' میری داڑھی نہ پکڑ' نہ میرے سر کے بال کھینچ' مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ تو آکر کہے گا کہ تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا"۔

حضرت ہارون کا موقف صبر و تحمل کا تھا---- حالاں کہ جرم بہت سنگین تھا---- اور اس کا مقصد جماعت کی وحدت کو بچانا تھا یہاں تک کہ حضرت موسی لوٹ آئیں اور دونوں میں اس مسئلہ کے حل کے لیے باہم مشورہ ہو جائے۔

حدیث میں آتا ہے:

"صبر و تحمل اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے"۔ (ترمذی)

ایک دوسری حدیث میں ہے:

بندے کی دعا قبول ہوتی ہے جب تک وہ جلدی بازی سے کام لے کر یہ نہ کہنے

لگے کہ میں نے دعا کی لیکن قبول نہیں کی گئی"۔ (متفق علیہ)

میری کتنی تمنا تھی اور مختلف مواقع پر --- اس دور میں جب انھیں سرگرمیوں اور نقل و حرکت کی آزادی حاصل تھی---- میں نے اسلامی تحریکوں سے کھل کر کہا بھی کہ وہ اپنی طاقت بچا کر رکھیں اور ایسی مقابلہ آرائیوں اور معرکوں میں اپنے آپ کو نہ پھنسائیں جن میں جلد باز مہم جو انھیں ڈھکیل دیتے ہیں یا جن میں چالاک مخالفین اپنے عیارانہ منصوبوں سے انھیں پھنسا دیتے ہیں۔ اس کے بجائے وہ اپنے آپ کو حکمت و خیر خواہی کے ساتھ ہر میدان میں اسلام کی صحیح تعلیمات کی طرف دعوت دینے میں مشغول رکھیں اور نئی نسلوں کو ذہنی، روحانی، جسمانی اور اجتماعی طور پر اسلام کے ذریعہ اور اسی کے لیے مکمل تربیت دیں نیز معاشرے کے مسائل حل کرنے، اس کی مشکلات کم کرنے، اس کی ضروریات پوری کرنے اور اسے صحیح راہ پر لگانے کے لیے معاشرے میں گھل مل جائیں اور کم از کم ایک لمبی مدت کے لیے (مثلاً بیس برس) حکمراں طاقتوں سے ٹکرانے اور طاقت و تشدد استعمال کرنے کا خیال بھی چھوڑ دیں۔ تب وہ جلد ہی دیکھ لیں گے کہ انھوں نے اپنے اس طریق کار سے پورے معاشرے میں ایک پرامن انقلاب پیدا کر دیا ہے اور ہتھیار اٹھائے یا جہاد کا علم بلند کیے بغیر نظریاتی، نفسیاتی اور اخلاقی تبدیلی برپا کر دی ہے۔

یہ خوف ناک اندیشہ ہمیشہ رہا ہے کہ اسلام سے خائف اور اس کی مخالف طاقتیں اسلامی تحریکوں کو پھلنے پھولنے اور اپنا دائرۂ اثر بڑھانے کا موقع نہیں دیں گی۔ وہ اچانک حملے کر کے ان کے قافلے کو تتر بتر کر دینے اور ان کے سفر میں رکاوٹ کھڑی کر دینے کے اقدامات کرتی رہتی ہیں اور حسب توقع انھیں کام کرنے کا موقع نہیں دیتیں۔

عملاً ایسا ہوتا رہتا ہے لیکن اسلامی تحریکوں پر بھی اس کی کچھ ذمے داری عائد

ہوتی ہے اس لیے کہ وہ اکثر ان مخالف طاقتوں کو بھڑکا دیتی ہیں اور ان میں ایسا خوف پیدا کردیتی ہیں جس سے ان کے اعصاب کشیدہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ تحریکیں اپنی عوامی طاقت کا کسی نہ کسی صورت میں مظاہرہ کردیتی ہیں جب کہ حکمت و دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر قدم پھونک کر رکھیں، حتی المقدور اپنے مخالفین کو وار کرنے کا کوئی موقع نہ فراہم کریں اور اللہ تعالیٰ سے عافیت کی دعا مانگتے رہیں۔ پھر اگر اس کے بعد بھی کوئی آزمائش نازل ہوتی ہے تو پھر صبر و ثابت قدمی کے علاوہ کوئی راستہ باقی نہیں رہ جاتا۔

۵۔ مبالغہ آرائی

جذباتیت کا ایک مظہر مبالغہ آرائی اور خوف کی نفسیات بھی ہے اور یہ آفت پوری امت کے ساتھ ہے کہ ہم تمام معاملات میں یا تو افراط سے کام لیتے ہیں یا تفریط سے۔ بہت کم وہ درمیانی موقف اختیار کرتے ہیں جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس امت کی تعریف فرمائی ہے:

و کذٰلک جعلناکم امۃ وسطا (البقرہ۔ ۱۴۳)

"اور اسی طرح ہم نے تم مسلمانوں کو ایک "امت وسط" بنایا ہے"۔

یہی آفت اسلامی تحریکوں میں بھی دراندازہوگئی ہے چناں چہ وہ خود اپنی تعریف و توصیف میں بھی، اپنے مخالفین پر نکتہ چینی میں بھی اور دیگر معاملات میں بھی مبالغہ آرائی اور خوف دلانے والی نفسیات سے کام لیتی ہیں۔ اسی لیے ان تحریکوں کے رہ نما و داعی اور اہل قلم عام طور پر ہر بات میں عظیم ترین، طاقت ور ترین، سب سے افضل و مثالی، حقیر ترین، کمزور ترین اور بد ترین جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں اسی طرح ان کی زبانوں پر شان دار و پر شکوہ الفاظ اور متاثر کن جملے چڑھے ہوئے ہیں۔

ہم خودپسندی میں بھی مبالغہ آرائی کرتے ہیں اور دوسروں پر نکتہ چینی میں بھی۔ کوئی بھی ذی ہوش اس سے اختلاف رائے نہیں کرسکتا کہ ہم اپنے آپ پر اور اپنی تہذیب پر فخر کریں۔ جو بھی امت بیدار ہونا اور آگے بڑھنا چاہتی ہو اس کے لیے یہ ضروری بھی ہوگا خاص طور پر جب اسے ایسی تہذیبی یلغار کا سامنا ہو جو اسے جڑ سے اکھاڑ دینا اور خود اپنے وجود کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا کردینے کے درپے ہو۔

لیکن خطرہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ احساس فخر ایسی خودپسندی میں تبدیل ہوجائے جو اسے اندھا بہرا کردے۔ اور خودپسندی تو ان تین مہلک چیزوں میں شمار ہوتی ہے جس کا ذکر حدیث شریف میں آیا ہے۔ (طبرانی میں حضرت انسؓ و حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی روایت میں جن تین مہلک چیزوں کا ذکر آیا ہے ان میں بخل اور خواہش نفس کی پیروی کے ساتھ خودپسندی بھی ہے)۔

خود قرآن کریم نے اس طرف اشارہ کیا ہے:

و یوم حنین اذ اعجبتکم کثرتکم فلم تغن عنکم شیئا (التوبہ : ۲۵)

"ابھی غزوۂ حنین کے روز اس کی دست گیری کی شان دیکھ چکے ہو' اس روز تمہیں اپنی کثرت تعداد کا غرہ تھا' مگر وہ تمہارے کچھ نہ کام آئی"۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ "تباہی و بربادی دو چیزوں میں ہے خودپسندی اور مایوسی"۔

امام غزالی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس قول میں دونوں کو اکٹھا اس لیے کیا گیا ہے کہ خوش بختی' کوشش و طلب اور محنت و جدوجہد سے حاصل ہوتی ہے اور مایوس شخص نہ کوشش کرتا ہے نہ جدوجہد کیوں کہ وہ جو کچھ چاہتا ہے وہ اس کی نگاہ میں ناممکن الحصول ہوتا ہے اور خودپسند یہ سمجھتا ہے کہ اس نے کوشش کرلی اور اس کا مقصد حاصل ہوگیا اس لیے وہ کوشش ہی نہیں کرتا جو چیز موجود ہے اسے

حاصل کرنے کی طلب نہیں ہوتی اور جو ناممکن ہو اسے طلب ہی نہیں کیا جاتا۔ خودپسند کی نگاہ میں اسے خوش بختی پہلے ہی سے حاصل ہوتی ہے اور مایوس کی نگاہ میں اس کا حصول ہی ناممکن ہوتا ہے اس لیے دونوں کو ایک جگہ جمع کیا گیا (کہ دونوں کا نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے)''۔

ہم دوسروں پر نکتہ چینی میں مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں خاص طور پر مغربی تہذیب پر تنقید میں۔ بلاشبہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مغربی تہذیب کے ساتھ کچھ بنیادی آفتیں لگی ہوئی ہیں جن سے وہ الگ نہیں ہوسکتی کیوں کہ وہ اس کی بنیاد میں شامل ہیں مثلاً مادہ پرستی، نفع پسندی اور نسلی امتیاز وغیرہ۔ لیکن ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اس تہذیب کے کچھ طاقت ور پوائنٹ بھی ہیں جنھیں سب سے پہلے انصاف کی بنا پر ذکر کرنا چاہیے پھر دشمن کے تعلق سے صحیح جان کاری کے لیے بھی۔

مثلاً مغربی تہذیب کی بنیاد تجرباتی علم، حسن انتظام، بہتر تنظیم، تعاون، ٹیم ورک یعنی گروپ کی شکل میں کام کرنے، سماجی اخلاق و کردار پر زور، انسان اور انسانی آزادیوں اور حقوق کے احترام بالخصوص اس تہذیب کے علم بردار ممالک کے اندر، شورائیت و جمہوریت سے ان کی گہری وابستگی اور حکمرانوں کے ظلم و استبداد کی مزاحمت وغیرہ پر قائم ہے۔

ہمارے شان دار ورثہ میں اس طرح کی قابل قدر مثالیں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اسلاف اپنے دشمنوں کے ساتھ کس حد تک انصاف اور ان کی خوبیوں کا کس درجہ اعتراف کرتے تھے چاہے ان کے ساتھ جنگیں ہی کیوں نہ ہو رہی ہوں۔

مثلاً صحیح مسلم کی روایت ہے (جی ہاں کسی ادبی یا تاریخی کتاب میں درج قصہ نہیں) کہ ''حضرت مستورد قریشی نے حضرت عمروؓ بن العاص کے سامنے بیان کیا میں

نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب قیامت برپا ہوگی اس وقت رومی لوگوں میں سب سے زیادہ ہوں گے۔ حضرت عمرؓ نے کہا غور کرلو کیا کہہ رہے ہو؟ حضرت مستوردؓ نے کہا: میں کہہ رہا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا فرماتے ہوئے سنا ہے تب حضرت عمروؓ بن العاص نے کہا اگر ایسا ہے تو ان میں چار خصوصیات ہیں۔ آزمائش کے وقت وہ لوگوں میں سب سے زیادہ بردبار ہوتے ہیں' مصیبت کے بعد سب سے زیادہ تیزی سے سنبھل جاتے ہیں' پسپائی کے بعد سب سے پہلے پلٹتے ہیں اور مسکین و یتیم و کمزور کے لیے سب سے زیادہ بہتر اور بھلے ہوتے ہیں اور پانچویں، بہترین خوبی ان میں یہ ہے کہ وہ بادشاہوں کے مظالم کی سب سے زیادہ مزاحمت کرتے ہیں۔"

حیرت ناک بات یہ ہے کہ رومیوں کو یہ سرٹیفکیٹ حضرت عمروؓ بن العاص جیسے مسلمان فوجی کمانڈر اور سیاست داں دے رہے ہیں جنہوں نے فلسطین و مصر وغیرہ میں رومیوں کے ساتھ بیشتر معرکوں میں حصہ لیا تھا لیکن اسلام نے انھیں یہی سکھایا تھا کہ وہ انصاف پر سختی سے قائم رہیں اور اللہ کے لیے سچی گواہی دینے والے بنیں چاہے وہ گواہی خود اپنے خلاف ہی کیوں نہ پڑے اور یہ کہ کسی قوم کی دشمنی انھیں بے انصافی تک نہ پہنچادے۔

جدید اسلامی تحریکوں کا جائزہ لینے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اپنی طاقت کا اندازہ کرنے میں مبالغہ آرائی سے کام لیتی ہیں اسی طرح اپنے مخالفین کی کمزوری بیان کرنے اور اپنی راہ میں حائل رکاوٹوں کو معمولی قرار دینے میں بھی مبالغہ آرائی کرتی ہیں۔ مزید برآں کسی کی تعریف' کسی کی مذمت' کسی سے محبت اور کسی سے نفرت کرنے میں بھی حد سے تجاوز کرجاتی ہیں۔ جب کہ حدیث میں آتا ہے:

"جس سے محبت ہو اس سے اعتدال کے ساتھ محبت کرو ہو سکتا ہے ایک دن

تمہیں اس سے نفرت اور دشمنی ہو جائے اسی طرح جس سے نفرت ہو اس سے اعتدال کے ساتھ نفرت کرو ہو سکتا ہے ایک دن اس سے تمہیں محبت ہو جائے"۔ (اور تب تمہیں اپنے پچھلے رویہ پر شرمندہ ہونا اور پچھتانا پڑے)

ایک مثل بھی اسی طرح ہے کہ "نہ تمہاری محبت ہی حد سے زیادہ تکلف والی اور تکلیف دہ ہونے پائے اور نہ تمہاری دشمنی ہی ہلاکت و بربادی تک پہنچا دینے والی ہونے پائے۔"

قرآن کریم نے ہمیں یہی سکھایا ہے کہ ہم جن سے محبت کرتے ہیں، جن سے نفرت کرتے ہیں، خود اپنے آپ کے ساتھ اور شدید ترین دشمن کے ساتھ انصاف اور اعتدال سے کام لیں:

یا ایہا الذین امنوا کونوا قوامین بالقسط شھدآء للہ و لو علی انفسکم او والوالدین و الاقربین۔ (النساء-۱۳۵)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علم بردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو"۔

یا ایہا الذین امنوا کونوا قوامین للہ شھداء بالقسط و لا یجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی و اتقواللہ۔ (المائدہ-۸)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے، اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو، کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔

۶- تجدید پسندی سے خوف

اسلامی تحریکوں کے کمزور پوائنٹوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ اجتہاد سے ڈرتی ہیں اور تجدید کی باتوں کا زیادہ خیر مقدم نہیں کرتیں اسی طرح ترقی و تبدیلی کے ساتھ ہم آہنگی اور کھلے دل سے کام لینے کا میلان نہیں رکھتیں۔

اگرچہ وہ کم از کم نظریاتی اعتبار سے۔ فقہی میدان میں اجتہاد کی حامی ہیں لیکن نظریاتی و تحریکی میدانوں میں تقلید ہی کی طرف مائل ہیں اور اس بات کو ترجیح دیتی ہیں کہ ہر قدیم چیز اپنی قدامت پر برقرار ہے۔

پھر یہ بات ان تحریکوں اور جماعتوں ہی تک محدود نہیں جو اسلام کو سمجھنے میں ظاہری طرز و اسلوب اور اس کی لفظی تشریح کی طرف مائل ہیں بلکہ تقریباً تمام ہی عصری اسلامی تحریکیں اس میں مبتلا ہیں حتی کہ وہ بھی جو کشادہ دلی اور وسعت نظر کی شہرت رکھتی ہیں اور ایسے تجربات سے گزر چکی ہیں جن سے انھیں تجدید اور تبدیلی کی ضرورت کا احساس اور حق حاصل ہوتا ہے۔

یہ تحریکیں اور جماعتیں بسا اوقات ایسی ظاہری صورتیں اور وسائل اختیار کرتی ہیں جو ان کے فروغ کی راہ میں روڑا بن جائیں اور بے ضرورت مشکلات اور دشواریاں پیدا کردیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ آزاد فکری اور ایسے تجدیدی رجحانات سے متنفر ہوتی ہیں جو مانوس و روایتی خیالات و اعمال کے خلاف ہوں۔ وہ سوچنے سمجھنے والے اہل فکر کو بھی اسی سانچے میں ڈھالنا اور اسی نظریاتی تنگی میں محصور و محبوس کردینا چاہتی ہیں۔ بسا اوقات ان کے بارے میں اس طرح کے فیصلے بھی صادر کردیتی ہیں کہ ان کی کتابیں نہ پڑھی جائیں اور ان کے پاس آمد و رفت نہ رکھی جائے۔ جس طرح کے فیصلے تاریک دور میں عیسائی مذہبی رہنما صادر کیا کرتے تھے۔

اس لیے یہ ناقابل فہم بات نہیں کہ اہل فکر و نظر یکے بعد دیگر ان سے دور

ہوتے جاتے ہیں جس طرح انگلیوں کے بیچ سے پانی نکل جاتا ہے۔ انھیں ان کے مقاصد سے اختلاف نہیں ہوتا بلکہ وہ اس چیز سے بھاگتے ہیں کہ ان کی ذہنی صلاحیتوں کو منجمد کردیا جائے۔ دوسری طرف یہ تحریکیں خود بھی ان کے ہٹ جانے سے چین کا سانس لیتی ہیں کیوں کہ ان کی وجہ سے بظاہر ان کے لیے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور ان کے ساکن پانی میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ بعض اسلامی جماعتیں اپنے پیروکاروں پر ایک خاص طرح کی تعلیم لازم قرار دیتی ہیں اور اسے اس طرح بار بار دہرایا جاتا ہے گویا قرآن پاک کی تلاوت کی جارہی ہو۔ پھر بھرے ہوئے کیسٹ کی طرح ان میں سے ہر ایک وہی بات دہراتا رہتا ہے۔ اس کا طرز عمل ایک سوچنے سمجھنے والے، تبادلہ خیال کرنے والے اور کچھ اخذ کرنے اور کچھ چھوڑ دینے والے انسان جیسا نہیں رہ جاتا۔ کسی بھی موقف کے بارے میں یا کئی پہلو رکھنے والے کسی معاملے کے بارے میں ان کے امیر یا سربراہ نے جو بھی کہہ دیا ہو وہی حق ہے اس میں کسی خطا اور غلطی کا امکان نہیں مانا جاتا۔

اگرچہ یہ جماعتیں نظریاتی طور پر صوفیانہ طرز تربیت کی مخالف ہیں جس میں مکمل سمع و طاعت اور اندھی پیروی پر زور دیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ جس نے اپنے شیخ یا پیر سے یہ دریافت کیا کہ ایسا کیوں ہے؟ وہ کبھی کامیابی نہیں پاسکتا اور پیر کے سامنے مرید کی وہی حالت ہوتی ہے جو نہلانے والے کے ہاتھ میں میت کی ہوتی ہے۔ تاہم یہ جماعتیں خود اپنے پیروکاروں میں بھی ایسا ہی رجحان پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں، اگرچہ صوفیا کی طرح زبانی طور پر ایسا نہیں کہتیں۔ پھر ان کے پیروکاروں میں جو بھی چون وچرا کرے اسے شک کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور اگر اس سے زیادہ کہنے لگے تو اسے سرکش و باغی قرار دے دیتی ہیں۔

اس سے بھی زیادہ افسوس ناک صورت یہ ہوتی ہے کہ یہ طرز عمل صرف

پیروکاروں اور متبعین کے ساتھ ہی محدود نہیں رہ جاتا بلکہ یہ خواہش کی جاتی ہے کہ علماء، اہل فکر و نظراور اہل قلم بھی اسی روایتی رنگ میں رنگ جائیں اور نظریاتی اعتبار سے بھی اور اپنی تعبیروں میں بھی مقررہ دائرے سے باہر نہ نکلیں اور اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو انھیں سخت ترین حملوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اسی لیے حیرت نہیں ہوتی کہ مرحوم ڈاکٹر سباعی کو انتہائی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جب انہوں نے اشتراکیت کے لفظ میں کشش محسوس کرنے والے حضرات کو مائل کرنے کے لیے اسلامی نظام عدالت کو "اسلامی اشتراکیت" کے نام سے موسوم کیا کیوں کہ اس طرح کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام اقتصادی تصادم کے اعتبار سے سرمایہ پرستی ہی کی ایک قسم ہے۔

ایک دوسرے صاحب قلم نے "المسلم المعاصر" نامی رسالہ کے پہلے شمارے میں ان لوگوں کی تردید کرنے کے لیے جو اسلام کے داعیوں کو ہمیشہ دائیں بازو میں شمار کرتے ہیں اور انھیں سرمایہ دارانہ نظام اور مغرب کا حامی و وفادار سمجھتے ہیں۔
یہ لکھ دیا کہ یہ رسالہ "بائیں بازو کے مسلمانوں" کا ترجمان ہوگا۔

میں اس طرح کی تعبیروں کا حامی نہیں، لیکن اس کی پوری حمایت کرتا ہوں کہ اہل فکر و نظر کو نیا اسلوب اختیار کرنے کا حق حاصل ہے اور چاہے وہ صحیح نتیجہ تک پہنچیں یا غلطی کر جائیں بہر حال انھیں ان کی نیک نیتی کا اجر ملے گا۔ میں ان کے آزادی رائے کے حق پر پابندی لگانے کو یکسر مسترد کرتا ہوں اسی طرح اس کو بھی مسترد کرتا ہوں کہ محض روایتی رائے کے برعکس کوئی رائے ظاہر کرنے ہی پر الزام تراشی اور طعن و تشنیع کا نشانہ بنالیا جائے۔ بسا اوقات اکثریت آج کسی رائے کو مسترد کرتی ہے لیکن ایک مدت کے بعد اسی کو مان لیتی ہے اور وہی سکہ رائج الوقت بن جاتی ہے۔

ایک تحریکی رسالہ نے ایک سرکردہ اسلامی قلم کار سے درخواست کی کہ وہ

اسے اپنے مقالات سے نوازیں۔ انھوں نے ایک مقالہ لکھ کر بھیج دیا جس میں اسلامی نظام کے زیر سایہ متعدد اسلامی جماعتوں کے قیام کے جواز کا ذکر کیا گیا تھا اور اس کے لیے دلیلیں اور اسباب پیش کیے گئے تھے۔ لیکن رسالہ کے ذمے داروں نے اس مقالہ کو شائع نہیں ہونے دیا کیوں کہ وہ اس روایتی رائے کے خلاف تھا کہ اسلام میں متعدد جماعتوں کا تصور ہی نہیں جب کہ یہ ایک مجمل بات ہے اور تشریح طلب بھی ہے کیوں کہ جب متعدد جماعتیں نہیں ہوتی تھیں تو اس وقت کے اپنے مخصوص حالات' پس منظر اور تقاضے تھے۔

اسلامی تحریک کے میدان میں سرگرم عمل ایک سرکردہ رہ نما کو ایک بار یہ ذمے داری سونپی گئی کہ وہ کام کا ایک پانچ سالہ منصوبہ تیار کریں۔ انھوں نے منصوبہ تیار کیا اور یہ تجویز بھی اس میں رکھی کہ جو طاقتیں اسلام سے خائف اور اس کی مخالف ہیں ان سے گفت و شنید کی جائے' مستشرقین اور دیگر مغربی اہل فکر و نظر کے ساتھ مذاکرات کیے جائیں' بڑھتی ہوئی مادہ پرستی کے مخالف اور اس کے خلاف جدوجہد کے لیے تیار و خواہش مند دیگر مذاہب کے رہ نماؤں اور کارکنوں سے بات کی جائے' سفارت کاروں اور سیاسی امور سے دل چسپی لینے والے حضرات سے سیاسی گفتگو کی جائے اور ایسا بار بار کیا جائے تاکہ یہ قدیم تصویر بدل جائے کہ اسلام ایک خوف ناک مذہب ہے' مسلمان وحشی ہیں اور اسلامی تحریکیں دہشت پسندی اور خونیں تشدد کی علم بردار ہیں تاکہ اسلام اور دیگر مذاہب کے درمیان پرامن بقائے باہم کا میدان ہموار ہو اور مسلمانوں کا یہ حق تسلیم ہو کہ وہ اپنے ممالک میں اپنے عقیدہ و شریعت کے مطابق حکومت چلائیں۔

حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس تجویز کو اکثریت نے مسترد کر دیا اور اس کا مذاق اڑایا یہاں تک کہ کسی نے یہ تک کہہ دیا کہ منصوبہ تیار کرنے والے رہ نما ترقی پسند

ہو گئے ہیں۔

اس طرح کے نظریاتی ماحول میں شدت پسند خیالات اور انتہاپسندانہ موقف ہی رواج پاتے ہیں اور انھیں خیالات کے لوگوں کو ہیرو سمجھا جانے لگتا ہے۔ پھر اس طرح کے ماحول میں دین پسند عوام کو خوش کرنے کے لیے شدت پسندانہ رائے اور بے لچک موقف کے اظہار کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔

اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ علم کو حکمرانوں کی خواہشات کے تابع بنانا ہی انحراف ہے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ علم کو عوام کی خواہشات کے تابع بنانا بھی انحراف ہے بلکہ میرے خیال میں عوام کی خواہشات کی پیروی کسی حکمراں کی خواہش کی پیروی سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے کیوں کہ جو لوگ حکمرانوں کی خواہش پر چلتے ہیں' وہ ننگے ہو جاتے ہیں اور انھیں آسانی سے مسترد کر دیا جاتا ہے لیکن جو لوگ عوام کی خواہشات پر چلتے ہیں انھیں لوگ سچے ہیرو سمجھنے لگتے ہیں۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں شدت پسندانہ نظریات کو فروغ' مخصوص پس منظر اور حالات میں حاصل ہوا جو اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ یہاں تک کہ معاشرے سے کٹ جانے' اپنے آپ کو اس سے بلند تر سمجھنے اور پورے معاشرے کو جاہلیت میں مبتلا سمجھنے تک بات جا پہنچی۔ لوگوں کو کافر قرار دینے میں غلو سے کام لیا جانے لگا اور عام مسلمانوں پر الزام لگایا جانے لگا کہ وہ کافر ہیں کیوں کہ وہ لا الہ الا اللہ کا مطلب ہی نہیں سمجھتے اور نہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر ایمان رکھتے ہیں اور ایک ایسے معاشرے میں موجودہ نئے مسائل کے حل تلاش کرنے کے لیے اجتہاد کی کوشش کو بے کار اور لغو قرار دیا جانے لگا' جو اسلام کی پیروی نہیں کرتا اور اسلامی نظام کی دعوت کو مسترد کرتا ہے جب کہ پہلا قدم یہ ہونا چاہیے تھا کہ لوگوں کو اسلامی عقیدہ سے پوری طرح روشناس کرایا جائے' ان کے سامنے اقتصادی' سیاسی اور سماجی نظام پیش کرنے کا

مرحلہ تو اس کے بعد میں آتا ہے۔

یہ ہیں وہ اہم خرابیاں اور کمزور پوائنٹ جن کی بنا پر موجودہ اسلامی تحریکوں پر نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ میں نے محض اللہ تعالیٰ کی خوش نودی کے حصول اور مطلوبہ درجہ کمال کے پیش نظر ہی ان کا ذکر کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اسلامی تحریکوں سے وابستہ حضرات اس تنقید سے تنگ دل ہوں گے اور گھبرائیں گے اور ان تحریکوں کے مخالفین ان باتوں کو غلط طور پر استعمال کرکے اور انھیں بڑھاچڑھا اور توڑ مروڑ کر اسلامی تحریکوں اور ان کے مقاصد کے بارے میں بلکہ خود اسلام کے بارے میں شک و شبہ پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ جیسا کہ میں پہلے ایک مثال بیان کرچکا ہوں۔ یہ مخالفین اس بات کو بالکل نظرانداز کردیں گے کہ اسلامی تحریکیں کس قدر دشوار گزار حالات میں کام کررہی ہیں اور پھر بھی انھوں نے کتنے قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں جن کے لیے ان کا شکرگزار ہونا چاہیے۔

خرابی کو دور کرنے اور مطلوبہ درجہ کمال تک پہنچنے کی بہترین راہ تلاش کرتے ہوئے ہم اگلے صفحات میں اس پہلو کا بھی ذکر کریں گے۔

تیسرا باب

امیدیں اور کام

ہم نے اب تک جو کچھ امت اسلامیہ اور اسلامی تحریکوں کے بارے میں ذکر کیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں--- جیسا کہ یاس و ناامیدی کے نقیب یا بدخواہ سمجھتے ہیں---- کہ امید کی کرن مفقود ہو چکی ہے یا راستہ ہی بند ہو چکا ہے۔

امت کی سطح پر بھی اور اسلامی تحریکوں کی سطح پر بھی بہت سے حوصلہ افزا اشارے اور علامتیں موجود ہیں۔ ہم سب کا یہ خیال کہ کچھ نہ کچھ خرابی اور کوتاہی ضرور ہے جسے دور کیا جانا چاہیے اور اس خرابی و مرض کی تشخیص اور اس کے علاج کی تجویز' ایک صحت مندانہ علامت ہے جو بہتر کل کی نوید سناتی ہے۔ خرابی و نقص کا شعور و ادراک درجہ کمال تک پہنچانے کی سمت میں پہلا قدم ہوا کرتا ہے۔

اسلامی تحریکوں کے ساتھ انصاف کیجیے

تاہم صحیح علاج کی سمت میں پہلا قدم یہ ہوگا کہ ہم اسلامی تحریکوں کے ساتھ انصاف سے کام لیں کیوں کہ وہ امت کی امیدوں کا مرکز ہیں' اسی لیے یہ بھی لازمی ہے کہ ہم کم از کم ان کی خوبیوں اور کارناموں کا بھی کسی قدر ذکر ضرور کریں جس طرح ہم نے ان کی خامیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کی خوبیاں کم اور معمولی بھی نہیں۔

لیکن اس سے پہلے ان اسباب کو بھی بیان کر دینا چاہیے جن کی وجہ سے اسلامی

تحریکیں کوتاہی کا شکار ہوئیں اور یہ کہ ان کی راہ میں کیسی کیسی رکاوٹیں حائل ہیں جنھیں ان کے لیے تنہا عبور کرنا ممکن نہیں۔

کام کا ماحول

اسلامی تحریکیں ایسے ماحول میں سرگرم عمل ہیں جنھیں خوش گوار نہیں قرار دیا جاسکتا جس میں اسلام کو اپنی بات صاف صاف کہنے کی اجازت نہیں۔ نہ اسلام کے فرزندوں کو اکٹھا ہونے کی آزادی حاصل ہے جب کہ اسلام کے علاوہ ہر مذہب اور ہر گروپ کو اپنی بات کہنے کی پوری اجازت ہے۔

جس اسلام کے لیے اجازت ہے وہ ہر طرح کی طاقت کے ذرائع اور زندگی کی جوش سے محروم ایک سپر انداز' حکومت کا حاشیہ بردار اور تابع فرمان اسلام ہے۔ ظلم و استبداد کے اس ماحول میں اسلامی تحریکوں کو اس طرح کام کرنا پڑتا ہے کہ ان کے ہاتھوں میں زنجیریں اور پیروں میں بیڑیاں ہوتی ہیں۔ ان پر اندرونی و بیرونی ہر طرف سے اور جسمانی' نفسیاتی' نظریاتی' اقتصادی' سیاسی اور پروپیگنڈے کے تمام ہتھیاروں سے حملہ کیا جاتا رہتا ہے۔ ابھی وہ ایک چوٹ سے سنبھلنے نہیں پاتیں کہ دوسرا زخم لگادیا جاتا ہے اور ایک آزمایش سے نکلنے نہیں پاتیں کہ اس سے زیادہ کسی ایسی سخت آزمایش میں ڈال دی جاتی ہیں کہ پہلی آزمایش کی تلخیاں بھی ماند پڑجاتی ہیں۔ ان کے لیے آزمایشوں کے زمانے اکثر رہتے ہیں اور عافیت کا زمانہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے گویا متنبی کا یہ شعر انہی کے لیے کہا گیا تھا کہ:

"میرا حال یہ ہوگیا ہے کہ جب مجھ پر تیر برستے ہیں
تو وہ (پہلے سے لگے ہوئے) تیروں ہی سے ٹکرا کر ٹوٹتے ہیں۔"

مختلف مسلم ممالک میں اور مختلف اوقات میں تجربات یہ ثابت کرچکے ہیں کہ

اسلامی تحریک آزادی کے سائے ہی میں پنپتی ہے۔ اسی ماحول میں سلیم فطرت اور صحیح عقل والوں سے اس کی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور گمراہ لوگ اس کے ذریعہ ہدایت پاتے ہیں اور ہدایت یافتہ لوگوں کی تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے۔

ایسے ہی ماحول میں بہت سے لوگ منفی رویہ سے مثبت کی طرف، گوشہ نشینی سے اجتماعی کام کی طرف، اپنی ذات کے بارے میں سوچنے کے دائرے سے پوری امت کے لیے سوچنے کی طرف اور اس نعرے سے کہ "ملک کو مالک کے لیے اور مخلوق کو خالق کے لیے چھوڑ دو" اس نعرے کی طرف کہ "خود اپنی اصلاح کرو اور دوسروں کو بھی اصلاح کی دعوت دو" لوٹنے لگتے ہیں:

و من احسن قولا ممن دعا الی اللہ و عمل صالحا و قال اننی من المسلمین۔ (حم السجدہ-۳۳)

اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔

واقعات و حقائق ثابت کرتے ہیں کہ ظلم و استبداد کی آندھیاں نہ صرف اسلامی تحریکوں کو مضمحل و بے بس کردیتی ہیں بلکہ ان کا گلا گھونٹ دیتی ہیں اور یہی منظر آج اگر سب میں نہیں تو بیشتر مسلم ممالک میں نظر آرہا ہے۔

تحریکیں برقرار ہیں

لیکن ان دشوار گزار حالات کے باوجود، جن میں اسلامی تحریکوں کو کام کرنا پڑ رہا ہے کوئی بھی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ تمام عرب و مسلم ممالک میں فکر و نظر، شعور و ادراک، سلوک و تربیت اور جدوجہد کی سطحوں پر اسلامی تحریکوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے، خاص طور پر ان ممالک پر استعمار کے تسلط، انھیں ایک لڑی میں

پرونے والی خلافت کی تباہی و خاتمہ، تعلیم یافتہ افراد پر مغربی طرز فکر کے غلبہ اور پھر مسلم ممالک کی زمام اقتدار و رہ نمائی پر لادینی نظاموں کے تسلط کے بعد سے کوئی بھی انصاف پسند مبصر یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسلامی تحریکیں مفلوج و بے کار اور ناپید ہو کر رہ گئیں۔ جب تک اسلام باقی ہے اس کے سرچشمہ سے طاقت حاصل کرنے والی یہ تحریکیں بھی باقی رہیں گی۔

اگر اسلامی تحریکیں مطلوبہ اسلامی ریاست قائم کرنے میں ناکام ثابت ہوئیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کا رول ہی ختم ہو گیا۔

مغربی مبصرین اس حقیقت کو بخوبی سمجھتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ جس دیو کو شکنجوں میں کس کر ایک کنویں میں بند کر دیا گیا ہے وہ کسی بھی لمحہ ان شکنجوں کو توڑ کر اور تمام جادوئی طلسمات کا پردہ چاک کر ایک طاقت ور اور زبردست وجود کی صورت میں باہر آسکتا ہے۔

اسلام اور مشرق کے ایک قدیم ماہر مشہور مستشرق "گب" اپنی کتاب "اسلام کا رخ کدھر" میں صاف صاف لکھ چکے ہیں:

"عام طور پر اسلامی تحریکیں ایسی حیرت انگیز تیزی سے نمودار ہوتی ہیں جن سے نگاہیں دہشت زدہ رہ جاتی ہیں۔ وہ اس طرح اچانک دھماکہ کی طرح سامنے آتی ہیں کہ اس کی علامتوں پر نظر رکھنے والے ششدر رہ جاتے ہیں۔ ان تحریکوں کے یہاں کمی صرف قیادت کے وجود کی ہوتی ہے یعنی یہ کہ کوئی نیا صلاح الدین ایوبی نمودار ہو جائے"۔

ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب ایک دوسرے مستشرق برنارڈ لوئس نے اپنی کتاب "مغرب اور مشرق وسطی" میں اخوان المسلمین کے بارے میں لکھا (جیسا کہ ممتاز ہم عصر عرب مورخ ڈاکٹر نبیہ امین نے نقل کیا ہے):

"ان کا طرز فکر اور مثالی نظریہ مراکش سے انڈونیشیا تک برابر مسلمانوں کی گہری امنگوں کی ترجمانی کرتا ہے اور یہ تنہا نمایاں بات ہے کہ گزشتہ ڈیڑھ صدی سے مشرق وسطی میں ہلچل پیدا کرنے والی تمام بڑی تحریکوں میں صرف اسلامی تحریکیں ہی اس خطہ کے لوگوں کی امنگوں کی سچی ترجمان رہی ہیں۔

لبرل ازم' فاشزم' نیشنل ازم' قوم پرستی' اشتراکیت اور سوشل ازم سبھی اصلاً یورپی نظریات ہیں چاہے مشرق وسطی میں انہیں جتنا بھی ردوبدل کر کے پیش کیا جائے جب کہ اسلامی تنظیمیں تنہا ایسی تنظیمیں ہیں جو اسی خطہ کی مٹی سے پیدا ہوئی ہیں اور مظلوم عوام کے احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اور اس کے باوجود کہ تمام اسلامی تحریکیں اب تک ناکامی وشکست ہی سے دوچار ہوتی رہی ہیں تاہم ابھی ان کا خاتمہ نہیں ہوگیا ہے"۔

کارنامے

اس کا اعتراف دوست بھی کرتے ہیں اور دشمن بھی کرنے پر مجبور ہیں کہ اسلامی تحریکوں نے مختلف میدانوں میں نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ مثلاً:

ا۔ ان تحریکوں نے اسلام کے تعلق سے بہت سے تصورات کو' جنہیں جمود وتعطل یا استعمار کے ادوار میں مسخ کیا گیا تھا' صحیح کیا اور اس ثقافتی یلغار کا مقابلہ کیا جس کے لیے میدان بہت سے اوقات میں خالی رہ گیا تھا اور جس نے امت کے بہت سے تعلیم یافتہ افراد کو متاثر کر لیا تھا۔

ان تحریکوں نے اسلامی لٹریچر میں کافی اضافہ کیا اور موجودہ دور کے مطابق ضروری کتابیں تیار کیں اور رسالے نکالے یہاں تک کہ بہت سے ایسے اہل قلم بھی' جو پہلے مغربی نظریات کے وفادار تھے ان سے متاثر ہوئے اور اسلام کی حمایت میں

لکھنے لگے۔ اس طرح ایک زبردست فکری لہر پیدا ہوئی جس کا اسلامی ورثے کو زندہ کرنے کی اہمیت پر زور دینے' اسے پھیلانے اور یونیورسٹیوں تک میں اسلامی موضوعات کی تعلیم میں گہرا اثر ہے۔

۲۔ اسلامی تحریکوں نے عام مسلمانوں میں اسلامی تشخص اور خیرامت سے انتساب کو بحال کیا اور ان کے دلوں میں یہ امید جگائی کہ اسلام کا مستقبل شاندار ہے جب کہ بیرونی حملوں اور اندرونی سوکشیوں کی بدولت شکستوں اور المیوں کے ایک طویل سلسلے نے انہیں مایوسی میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان تحریکوں نے مغربی تہذیب کے بت کو توڑ ڈالا اور مسلمانوں کے دل و دماغ کو اس تہذیب کی نگاہیں خیرہ کر دینے والی اور ذہنوں کو مبہوت کر دینے والی چمک دمک کے سامنے روحانی و اخلاقی شکست و کمتری کے احساس سے آزاد کرایا۔ خاص طور پر مغربی تہذیب اس لیے بھی اثرانداز ہونے میں کامیاب ہوئی کہ وہ اپنی ترقی وطاقت کی بلندیوں کے دور میں سامنے آئی تھی جب کہ ہم اس دور میں کمزوری و پس ماندگی کی پستیوں میں سسک رہے تھے۔

۳۔ اسلامی تحریکوں نے مسلمان مردوں اور عورتوں کی ایک ایسی نسل تیار کر دی جو عقائد و عبادات' طرز فکر و سلوک اور دعوت وجدوجہد کے اعتبار سے اسلام سے پوری وابستگی رکھتی ہے اور یہ نسل دنیا کے مختلف حصوں میں اپنی تعداد کے اعتبار سے دن بدن بڑھتی چلی جارہی ہے۔ یہ نسل ربانی طرز فکر و نظر' قرآنی اخلاق' محمدی طریقوں اور اسلامی احساسات و نظریات کی حامل ہے۔ اس نے بیرونی محاذ پر استعمار اور صیہونیت کے خلاف جہاد میں اور اندرونی سطح پر لادینیت اور سرکشی کے خلاف جدوجہد کے میدانوں میں اللہ کی خوشنودی کے لیے یکے بعد دیگرے بہت سی جانیں شہادت کے لیے پیش کیں اور ایسی سخت آزمائشوں میں بھی ثابت قدم رہیں جن میں اذیت رسانی اور ظلم وستم کے ایسے ایسے ذرائع استعمال کیے گئے جن کی آنچ سے لوہا

بھی پگھل جائے‘ ان کے جسموں کو اذیت دی گئی‘ انہیں بھوکا پیاسا رکھا گیا‘ لیکن ان سب کے نتیجے میں ان کے ایمان کو تقویت ہی ملی۔

۴۔ اس پابند اسلام نسل کے پیچھے‘ اسلامی تحریکوں نے ایسی اسلامی رائے عامہ ہموار کی جو اسلام کی نصرت‘ اس کی دعوت سے محبت اور اس کی شریعت سے وفاداری کا اظہار نیز الحاد و بے دینی اور اباحیت کو ناپسند کرتی ہے۔ اسلامی شریعت کے نفاذ اور شریعت کے احکام کی طرف رجوع کی اپیلوں‘ متعدد ممالک کے دستوروں میں یہ صاف صاف تحریر کیے جانے کہ اسلامی شریعت ہی قانون سازی کا پہلا اور بنیادی سرچشمہ ہے اور بعض حکمرانوں کی طرف سے عوام کے اس مطالبے کو تسلیم کیے جانے کی صورتوں میں سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے۔ اسلام کے وفادار اور لادینیت کو مسترد کرنے والے عوام کا حلقہ دن بدن وسیع تر ہوتا جارہا ہے یہاں تک اصلاً لادینی سیاسی پارٹیاں بھی ان کی چاپلوسی کرنے پر مجبور ہیں اور شریعت کے احکام کو تسلیم کرنے کا اعلان و دعویٰ کر کے انتخابات میں ان کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

۵۔ اسی طرح اسلامی تحریکوں کا جدید اسلامی بیداری میں سب سے بڑا ہاتھ ہے جس میں بے شمار تعلیم یافتہ نوجوان مرد اور عورت عالم اسلام کے مختلف حصوں میں اور عالم اسلام سے باہر امریکا‘ یورپ اور مشرق میں بھی حصہ لے رہے ہیں۔ افغانستان اور فلپائن وغیرہ کے جہاد میں اس کا نمایاں اثر رہا۔ اسی طرح اسلامی بینکوں اور اقتصادی اداروں کے قیام نیز وسیع پیمانے پر اسلامی لٹریچر کی نشرواشاعت میں بھی اس کا اثر نمایاں ہے۔ بلاشبہ یہ پائیداری فکر و نظر اور جذبات و طرز عمل سب سے تعلق رکھتی ہے اور اللہ کی وسیع زمین میں اس کے اثرات محسوس ہوتے ہیں۔

اس لیے یہ انصاف کی بات نہیں ہوگی کہ ہم یہ کہہ دیں کہ اسلامی تحریکیں اپنی مہم میں ناکام ہوگئیں۔ کیوں کہ اس مہم کے متعدد پہلو ہیں۔ جس مسلمان فرد کی حمایت

بھی حاصل ہوتی ہے اور اسے جدید جاہلیت یا گم گشتہ راہی سے نکال کر اسلامی نظریات واخلاق کے دائرہ میں لایا جاتا ہے وہ اسلامی تحریکوں کا ایک کارنامہ ہوتا ہے اور اس سے یہ تحریکیں اپنے مقاصد میں سے ایک مقصد حاصل بھی کر لیتی ہیں اور دیگر مقاصد سے قریب بھی پہنچ جاتی ہیں۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ "اگر اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ ایک شخص کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بھی (جو اس زمانے میں نہایت قیمتی سرمایہ سمجھے جاتے تھے) زیادہ قیمتی ہے۔"

یہ اسلامی تحریکیں ہی ہیں جنہوں نے اپنے علماء کے افکار و خیالات، اپنے داعیوں کے صبر و تحمل، اپنے پیروکاروں کی جانفشانی و استقامت، اپنے نوجوانوں اور بوڑھوں کی قربانیوں اور اپنی تاریخ کے شاندار ورثہ کی بدولت اس اسلامی بیداری کے لیے راستہ ہموار کیا اور اسے پردہ خفا سے اسٹیج پر لا کھڑا کیا۔ انصاف کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اسلامی تحریکوں کے نظریات و تعلقات میں نئی پیش رفتوں کو بھی نوٹ کیا جائے۔

ہم نے دیکھا کہ مصر میں اخوان المسلمین کے لوگوں نے جدید وفد پارٹی سے انتخابات میں تعاون کیا تاکہ پارلیمنٹ میں پہنچ کر اسلامی دعوت کی آواز ممبران پارلیمنٹ کے کانوں تک پہنچا سکیں اگرچہ بعض شدت پسند اس کے مخالف تھے۔ دوسری جگہ ہم نے دیکھا کہ اسلام پسند اپوزیشن کے لوگ قوم پرست طاقتوں سے تعاون کر رہے ہیں تاکہ اسلام کی کھل کر مخالفت کرنے والے طاغوتی نظام کو گرایا جا سکے۔ جب کہ مخلصین کا ایک گروپ اسلام کی پیروی نہ کرنے والے کسی بھی فرد، گروپ یا ادارے کے ساتھ کسی بھی مفاہمت کو مسترد کر رہا تھا۔

شام میں اسلامی تحریک نے اپنے اصلاحی و سیاسی پروگرام نیز قومی و بین الاقوامی تعلقات کے تعلق سے نیا موقف اختیار کیا۔

پاکستان میں مولانا مودودی کی زندگی ہی میں جماعت اسلامی نے اپنے انتخابی

منشور میں شوریٰ کی رائے کو ماننا لازمی قرار دیا۔ ساتھ ہی جماعت نے ظلم کی روک تھام یا حق کے حصول کے لیے ناگزیر حالت میں مزدوروں کی ہڑتال پر بھی صاد کیا اسی طرح ایسے دوسرے نرم اور وسعت پسندانہ خیالات بھی اپنائے جو پہلے قابل قبول نہیں سمجھے جاتے تھے۔

مزید عمل اور کشادہ دلی کی ضرورت

لیکن اس کے باوجود اسلامی تحریکوں کو اپنے آپ سے وابستہ امیدوں کو پورا کرنے کے لیے مزید جدوجہد اور کشادہ دلی سے کام لینا ہوگا۔ انہیں بات چیت کے مرحلے سے آگے بڑھ کر کام کے مرحلے میں داخل ہونا ہوگا اور اس آفت سے بھی آزادی حاصل کرنی ہوگی جو ہم مسلمانوں میں عام ہے اور جس سے ہمارے سفر میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں یعنی ماضی پر زیادہ سے زیادہ مرثیہ خوانی اور نوحہ خوانی اور حال کے لیے کم سے کم کام۔ مرثیہ خوانی سے جو کچھ کھویا جاچکا وہ واپس تو ملنے سے رہا۔ ہماری مصیبت یہ بھی ہے کہ ہمارے یہاں شکوہ شکایت کرنے والے اور درد ظاہر کرنے والے تو بہت ہیں اور علاج و مداوا کرنے والے بہت کم' اندھیروں کو برا بھلا کہنے والے بہت ہیں اور چراغ جلانے والے بہت کم۔ ہاں' شکوہ شکایت عام ہے اور امراض و آلام کا ذکر بھی بہت ہوتا ہے یہاں تک کہ ہر ایک نالہ کناں اور شاکی نظر آتا ہے لیکن آخر شکایت کس سے ہے؟ ہم میں سے ہر ایک شاکی ہے تو ہر ایک شکایت کا موجب بھی ہے۔

ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک فصیح و بلیغ واعظ نے ایک دن لوگوں میں ایسا اثر انگیز وعظ کہا کہ سب لوگ رونے لگے۔ پھر واعظ نے دیکھا تو کوئی اس کی کتاب چوری کر لے گیا تھا۔ اس نے حاضرین پر نگاہ ڈالی کہ شاید کسی چہرے پر اس جرم کا اثر

جھلک رہا ہو۔ لیکن سب کو روتے ہوئے پایا تو کہنے لگا تم سب کے سب تو رو رہے تو پھر کتاب کس نے چوری کی؟

یہ لازمی بات ہے کہ اسلامی تحریکیں شکوہ شکایت اور زمانے کو برا بھلا کہنے سے آگے بڑھ کر مسلسل کام کے دور میں داخل ہوں اور وہ کام اسلام اور زمانے کے معیار کے مطابق اور اس معیار کے مطابق ہو جو دوسرے لوگ اپنے مذاہب کے لیے اپنائے ہوئے ہیں۔ حال کے لیے کام، مستقبل کے لیے کام، عمارت کی تعمیر کے لیے کام اور پھر اسے گرنے سے بچانے کے لیے بھی کام، یہ کہہ کر ہم اللہ تعالیٰ کے محاسبے سے بچ سکتے ہیں نہ لوگوں کی لعنت ملامت سے، نہ تاریخ کے سوالات سے اور نہ ہی ضمیر کی سرزنش سے کہ ہم ان سازشوں کا شکار ہوئے جو بیرونی اسلام دشمن طاقتوں نے تیار کی تھیں جنھیں ان کے اندرونی ایجنٹوں نے عملاً نافذ کیا تھا۔ آخر ہم کب تک دشمنوں کی سازشوں کی آماج گاہ بنے رہیں گے؟ کب تک ہم اپنے خلاف دوسروں کی منصوبہ بندیوں کا رونا روتے رہیں گے اور خود اپنے لیے منصوبے نہیں تیار کریں گے۔ آخر ہم کیوں ان کے تخریبی منصوبوں کے مقابلے میں تعمیری منصوبے نہیں لاتے کہ لوہے کو تو لوہا ہی کاٹتا ہے۔

خواص و عوام دونوں کی تائید کا حصول

اسلامی تحریکوں کے لیے یہ بھی ناگزیر ہے کہ وہ پوری سنجیدگی اور عزم کے ساتھ خواص و عوام کے دلوں تک پہنچنے اور ان دیواروں کو ہٹانے کی کوشش کریں جو ایک طرف ان کے اور تعلیم یافتہ حضرات کی ایک بڑی تعداد کے درمیان اور دوسری طرف ان کے اور عوام کے جم غفیر کے درمیان حائل ہیں۔

تعلیم یافتہ حضرات---یا کم سے کم ان کی بڑی تعداد---پر درانداز نظریات

وافکار، اس طرح اثرانداز ہوئے ہیں کہ ان کے احساسات اور وابستگیوں میں بھی اس کی صاف جھلک ملتی ہے۔ وہ بھی اسلام کے بارے میں ویسے ہی خیالات رکھتے ہیں جس طرح کے خیالات اہل مغرب عیسائیت کے بارے میں رکھتے ہیں اور وہ اسلام کے ساتھ بھی وہی سلوک کرتے ہیں جو سلوک اہل مغرب نے عیسائیت کے ساتھ کر رکھا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام اور سائنس کے درمیان عدوات اور دشمنی ہے اور شریعت اور ترقی کے درمیان ٹکراؤ پایا جاتا ہے۔ ان کے خیال میں مذہب کا تعلق فرد کے قلب وضمیر سے ہے یا یہ کہ مذہب کو مسجد کے اندر رہنا چاہیے اس سے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ وہ اسلامی تاریخ اور ورثہ کو مخالفت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جب کہ مغرب کی ہر چیز کو مقدس سمجھتے ہیں اس سے وفاداری و وابستگی کا تعلق رکھتے ہیں۔ مغربی نظریات و تہذیب کے علم برداروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور انہیں کو اپنے لیے نمونہ و رہ نما بناتے ہیں۔

اسلامی تحریکوں کو اپنے تمام مکاتب فکر اور جماعتوں اور شخصیتوں کے ساتھ تعلیم یافتہ خواص کے ساتھ زیادہ محنت کرنی چاہیے۔ انہیں خود انہیں کی زبان واسلوب میں مخاطب کرنا چاہیے تاکہ وہ ان کے شکوک وشبہات کو بخوبی جان سکیں اور الزام تراشی وتہمت طرازی کے بجائے علم کی روشنی میں انہیں دور کر سکیں، ان کے سوالات کے جوابات فراہم کر سکیں اور ان کے ساتھ پر سکون ماحول میں طویل عملی تبادلہ خیال کر سکیں۔ بلاشبہ تعلیم یافتہ حضرات میں بڑی تبدیلی آچکی ہے اور فکری یلغار کے نتیجے میں ان پر جو خیالات چھا گئے تھے بہت سے حضرات ان کے تعلق سے اپنی رائے بدل چکے ہیں اور ان میں سے بہت سے حضرات خود اسلامی عمل کے قافلے میں شامل ہو چکے ہیں۔

رہے عوام تو اسلامی تحریکیں بنیادی طور پر اس لیے قائم ہوئی تھیں کہ انہیں

اوپر اٹھائیں اور ان کی دست گیری کریں، جو جاہل ہوں انھیں تعلیم دیں اور جو مظلوم ہوں انھیں انصاف دلائیں، لیکن شاطر مخالفین ان کی خاطر خواہ تعداد کو ان تحریکوں سے ڈرانے، ان سے متنفر کرنے، ان کے بارے میں جھوٹی باتیں پھیلا کر ان سے برگشتہ کرنے یا کم از کم ان کے مستقبل سے مایوس کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

اسلامی تحریکوں کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ وہ تنہائی کی اس دیوار کو گرانے اور اس رکاوٹ کو دور کرنے نیز عوام کے دلوں تک پہنچنے کی سرگرم کوشش کریں کیوں کہ یہ تحریکیں سب سے زیادہ ان کی ترجمانی کی حق دار ہیں اور انھیں کے درمیان سے اٹھی بھی ہیں اور انھیں کے ذریعہ اور انھیں کے لیے قائم بھی ہیں۔ ہمارے عوام اپنی فطرت اور اپنی تاریخ پر یقین رکھتے ہیں اور اسلام کی تحریک اور ایمان کی پکار پر لبیک کہنے والے ہیں۔ تاریخ سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے اور حقائق و واقعات بھی یہی ثابت کرتے ہیں۔ اسلامی تحریکیں تبھی کامیابی سے ہم کنار ہوں گی جب مسلمانوں کے کسی گروپ کے بجائے تمام مسلمانوں کی تحریک کی شکل اختیار کر جائیں۔

اسلامی بیداری کو صحیح رخ دینے کی ضرورت

یہ بھی ناگزیر ہے کہ اسلامی تحریکیں اس بات کے لیے نظریاتی و عملی کوششیں کریں کہ اسلامی بیداری کو صحیح رخ دیا جاسکے اور اسے صحیح راستے پر گامزن کیا جاسکے جس میں ٹھوکر لگنے اور گڑھوں میں گرنے کا امکان نہ رہ جائے، غلو اور کوتاہی سے دور رہا جاسکے ساتھ ہی ان ہلاکتوں میں پڑنے سے بچا جاسکے جو اسلامی تحریکیں اپنے غلط اندازوں کی وجہ سے خود فراہم کردیتی ہیں یا جو ان کے مخالفین ان کے لیے تیار کرتے رہتے ہیں۔

بہت سے واقعات اور دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ کچھ بیرونی طاقتیں اور خفیہ

مخالف قوتیں پوری مہارت اور چالاکی سے سازشیں کرتی ہیں اور چھپ کر اندھیرے میں منصوبے بناتی ہیں کہ اسلامی بیداری کو ایسی خندق میں گرادیں جہاں سے وہ نکل ہی نہ سکے یا ایسی کش مکش میں مبتلا کردیں جس کا کوئی جواز ہی نہ ہو اور اسے فرائض کے بجائے نوافل میں، اصول کے بجائے فروع میں، بنیادی چیزوں کے بجائے غیراہم ظاہری چیزوں میں اور متفقہ باتوں کے بجائے اختلافی باتوں میں الجھادیں۔ اسی طرح وہ جس چیز کو "مذہبی انتہاپسندی" کا نام دیتی ہیں اسے پروان چڑھانے اور طاقت بخشنے پھر اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنے معاشرے میں نمودار ہونے والی ہر چیز کو بیرونی اثرات اور سازشوں کا نتیجہ سمجھتے ہیں چاہے وہ صلیبی اثرات اور سازشیں ہوں یا صیہونی یا اشتراکی۔ جن میں شعوری یا غیر شعوری طور پر مقامی طاقتوں کو استعمال کرلیا جاتا ہے کیوں کہ اس طرح کا خیال آخر کار ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ ہمیں کوئی اختیار ہی حاصل نہیں ہم تو صرف پابند و آلہ کار ہیں جیساکہ دینی جبر کے حامی کہتے ہیں یا جیساکہ سیاسی جبر کے نظریہ کے حامیوں کا خیال ہے کہ ہم محض شطرنج کے مہرے ہیں ہمارے اختیار کے بغیر بڑی طاقتیں ہمیں ادھر سے ادھر حرکت دیتی رہتی ہیں۔

اس معاملے میں میرا خیال ہے کہ جس چیز کو "مذہبی انتہاپسندی" کا نام دیا جاتا ہے اس کے متعدد اسباب ہیں اور ان کا تفصیلی ذکر میں اپنی کتاب "اسلامی بیداری" میں کرچکا ہوں تاہم یہ اسباب ہر چیز سے پہلے خود ہمارے اپنے اندر ہیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایسی طاقتیں موجود ہیں جو اسلام کی کامیابی اور معاشرے میں اس کے قائدانہ کردار کی بحالی کی دشمن ہیں۔ انھوں نے اس انتہاپسندی کے رجحان کو پوری چالاکی اور مکاری سے استعمال کیا ہے اور وہ اسے مزید غذا فراہم

کرکے اسے پروان چڑھانا چاہتی ہیں اور اس آگ کو ایندھن فراہم کرتی رہتی ہیں تاکہ وہ بھڑکتی رہے' بجھنے نہ پائے۔ اس طرح ان کے پیش نظر بہت سے فائدے ہوتے ہیں مثلاً :

۱۔ عوام الناس کو اسلام کو زندگی میں ایک حکمراں نظام کی حیثیت سے نمودار ہونے سے متنفر اور دہشت زدہ کیا جاتا ہے اور یہ دکھایا جاتا ہے کہ اسلامی نظام کے علم بردار اور اسلامی بیداری کے نمائندے شدت پسند اور تنگ نظر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں میں کشادگی و آسانی مرحمت فرمائی ہے انھیں وہ بندوں کے لیے تنگ کردینا چاہتے ہیں جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ سے فرما چکے ہیں کہ:

''تمھیں آسانی پیدا کرنے والا بنا کر بھیجا گیا ہے نہ کی تنگی پیدا کرنے والا''۔ (بخاری)

اس طرح عوام جو آسانی کو پسند اور تنگی کو ناپسند کرتے ہیں اسلامی بیداری سے الگ' بلکہ بعض اوقات اس کے دشمن اور مدمقابل ہوجاتے ہیں اور یہ بہت بڑا نقصان ہے۔

۲۔ نوجوان نسل جسے اسلامی بیداری کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے' اسے جزوی مسائل اور غیر اہم قضیوں میں الجھا دیا جاتا ہے اور دعوت کے میدان میں اس کی جو نظریاتی و عملی توانائیاں لگی ہوتی ہیں انھیں فروعی باتوں پر بحث مباحثے اور لڑائی جھگڑے میں پھنسا دیا جاتا ہے اس طرح وہ ان اہم اور بنیادی مسائل سے غافل ہوجاتی ہے جن کا تعلق اسلام کی بقا' امت کی رہ نمائی' ملکوں کی آزادی اور زمین پر اسلامی شریعت کے نفاذ سے ہوتا ہے۔

۳۔ اسلامی تحریکوں کو باہم ایک دوسرے سے ٹکرا دیا جاتا ہے اس طرح ان کی جو توانائیاں مشترکہ دشمن کے خلاف لگنی چاہئیں وہ باہمی کشمکش اور ایک دوسرے پر الزام تراشی میں لگ جاتی ہیں۔ نوبت ایک دوسرے کو گناہ گار اور کافر قرار دینے تک

جا پہنچتی ہے اس طرح وہ ایک دوسرے کی شخصیت تباہ کرنے اور اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں مسمار کرنے میں لگ جاتی ہیں اور دشمن اطمینان و سکون کے ساتھ تفریح لیتا ہے اور جب وقت آتا ہے تو بچی کھچی طاقت کو بھی نیست و نابود کرنے کے لیے قدم اٹھالیتا ہے۔

۴- جو حکمراں طاقتیں اسلامی دعوت سے خوف زدہ اور دل سے اس کو ناپسند کرتی ہیں اور موقع کی تلاش میں رہتی ہیں انھیں پورے اسلامی عمل پر ضرب کاری لگانے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے اور "انتہاپسندی" اور "انتہاپسندوں" کی مزاحمت کے نام پر ساری اسلامی تحریکوں پر ہلہ بول دیتی ہیں۔

۵- لوگوں میں اسلام اور اس کے داعیوں کے تعلق سے مایوسی پیدا کردیتی ہیں اور یہ یقین دلادیتی ہیں کہ یہ اسلامی بیداری جوار بھاٹا کا تماشا ہے اور اس بیداری کا انجام محض خواب غفلت ہے اور کوئی بھی اسلامی کام کرنے کا کوئی فائدہ نہیں جب آخر کار اسے اندرونی یا بیرونی ذریعہ سے تباہی و بربادی کا سامنا ہی کرنا ہے۔

اسلامی تحریکوں کے لیے میری یہی خیر خواہانہ نصیحت ہے کہ وہ اسلامی بیداری کو صحیح رخ دینے کی کوشش کریں۔ اس پر مسلط ہونے کی خواہاں نہ ہوں کیوں کہ اسی میں اسلامی تحریکوں اور اسلامی بیداری کا بھی بھلا ہے اور خود امت اسلامیہ کی بھی بھلائی ہے کہ اسلامی بیداری آزاد اور کشادہ دل رہے کسی بھی جماعت' پارٹی یا ادارے سے منسوب نہ ہوجائے اس کشادہ دلی کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ معاشرے کے مختلف گوشوں تک پہنچ جائے گی اور ایسی نفسیاتی' سماجی یا سیاسی رکاوٹیں حائل نہیں ہوپائیں گی جو کسی خاص نام' خاص حلقہ اور خاص تاریخ سے منسوب ہونے کی وجہ سے اسلامی دعوت کے پھیلاؤ کی راہ میں کھڑی ہوجاتی ہیں اور جس کے روایتی مخالف اور حریف ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی اسلامی بیداری ظالم حکمراں طاقتوں کی دہشت خیزی سے

بھی دور رہے گی جو اس بیداری کو گھیر لینے اور اس پر کاری ضرب لگانے کا موقع نہیں پا سکیں گی۔

رہ نما خطوط

جولائی ۱۹۸۴ء میں الجزائر میں ''اسلامی بیداری'' کے موضوع پر جو کانفرنس منعقد ہوئی تھی میں نے اس میں اسلامی بیداری کے مستقبل کے تعلق سے امیدوں اور اندیشوں کا ذکر کرتے ہوئے اسے صحیح رخ دینے اور مشکلات اور غلطیوں سے بچانے کے لیے کچھ تجویزیں پیش کی تھیں تاکہ وہ مطلوبہ امیدوں کو عملی روپ دے سکیں اور خطرات سے بچ سکیں۔ ان تجویزوں میں یہ بات بھی شامل تھی کہ اسلامی بیداری کو مرحلہ وار آگے بڑھایا جائے اور اسے ہمہ گیر وسعت دی جائے تاکہ وہ ہر طرف پھیل سکے خاص طور پر تعلیم یافتہ نوجوانوں میں۔ اس سلسلے میں بیس بنیادی نکات پیش کیے گئے تھے جنھیں پایہ تکمیل تک پہنچانے کے بعد اسلامی بیداری پوری امت کی رہ نمائی کے لائق ہو سکتی تھی اور دلوں میں جاگزیں اسلامی عقیدہ اور معاشرے کی قیادت سے اسلام کی دوری کی عملی حقیقت کے درمیان تضاد ختم ہونے کی صورت نکل سکتی تھی۔

یہاں ان تفصیلی نکات کو مختصراً پیش کیا جا رہا ہے جو اسلام کو سمجھنے، اس کی دعوت، اسلام کے لیے سرگرم دیگر حضرات کے ساتھ تعلقات اور کچھ نہ کرنے والے مسلمانوں، نیز ناواقفیت رکھنے والے، ڈرنے والے اور کینہ و نفرت رکھنے والے غیر مسلمین کے ساتھ رویہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہ بات ناگزیر ہے کہ توجہ کا مرکز منتقل ہو :

۱- فروع اور جزئیات کے بجائے اصول اور کلیات پر زور۔

۲- نوافل کے بجائے فرائض پر زور۔
۳- اختلافی چیزوں کے بجائے متفقہ باتوں پر زور۔
۴- جسمانی اعمال کے بجائے قلبی اعمال پر زور۔
۵- غلو و تفریط کے بجائے اعتدال اور میانہ روی پر زور۔
۶- تنگی پیدا کرنے اور متنفر کرنے والی باتوں کے بجائے آسانی و خوش دلی پیدا کرنے والی باتوں پر زور۔
۷- جمود و تقلید کے بجائے تجدید و اجتہاد پر زور۔
۸- گفتگو اور بحث و مباحثے کے بجائے عمل اور کچھ دینے کے جذبے پر زور۔
۹- جذباتیت اور وقتی اقدام کے بجائے عملیت پسندی اور منصوبہ بندی پر زور۔
۱۰- اختلاف رائے کرنے والوں کے خلاف تعصب کے بجائے ان کے ساتھ رواداری پر زور۔
۱۱- مسائل میں واعظانہ مبالغہ آمیز اسلوب کے بجائے فقیہانہ اسلوب کو ترجیح یا منبر کے پر جوش اسلوب کے بجائے نشست کے پر سکون اسلوب کو ترجیح۔
۱۲- تعداد کے بجائے کوالٹی پر زور (یعنی تربیت کے بغیر تعداد بڑھانے کے بجائے تعداد کی پرواہ کیے بغیر تربیت پر توجہ)۔
۱۳- خوابوں کے آسمان کے بجائے حقیقت پسندی کی زمین پر توجہ۔ (یا مثالی رومانوی تصور کے بجائے قابل وجود و ممکن پر زور)
۱۴- معاشرے سے اپنے آپ کو بلند تر سمجھنے کے بجائے اس کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے پر زور (یا الزام تراشی کے بجائے طبیب کی طرح ہمدردانہ موقف اختیار کرنے پر زور)
۱۵- ماضی میں گم رہنے کے بجائے حال کے ساتھ ہم آہنگی اور مستقبل کے لیے

تیاری پر زور۔

۱۶- سیاسی عمل میں غرق ہونے کے بجائے سماجی کام پر توجہ۔

۱۷- ٹکراؤ اور عداوت والے اختلاف کے بجائے تعاون اور تنوع والے اختلافات رائے پر توجہ۔

۱۸- زندگی کے معاملات کو نظرانداز کرنے کے بجائے ان میں مہارت پیدا کرنے پر توجہ۔

۱۹- تنگ نظر علاقہ پرستی کے بجائے وسیع النظر عالمی نقطہ نظر پر زور۔

۲۰- خودپسندی کے بجائے محاسبہ نفس پر زور (یا اپنے بارے میں غلو کے بجائے خود احتسابی پر زور)۔

یہ بیس نکات ہیں جنھیں میں اسلامی بیداری اور اسلامی تحریکوں کے لیے لائحہ عمل کی طرح خیال کرتا ہوں۔ بلاشبہ ان میں سے ہر نکتہ تشریح و تفصیل چاہتا ہے جو میں ان شاء اللہ کبھی آیندہ پیش کروں گا۔

سماجی کام

اسلامی تحریکوں کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ وہ اپنے لیے کام کے ایسے میدان متعین کریں جن کے ذریعے دین کی خدمت بھی ہو اور امت کی بھی۔ سیاسی سرگرمیوں ہی میں اپنی ساری جدوجہد اور سارا وقت برباد نہ ہونے دیں۔

مثلاً سماجی خدمات کا میدان ایسا ہے جس میں مسلمانوں نے حد سے زیادہ کوتاہی برتی ہے چناں چہ ان کے دشمنوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں میں جو مفلوک الحال، فاقہ مست، مریض، جاہل اور الگ تھلگ پڑے ہوئے لوگ تھے ان میں اپنے مذاہب کو پھیلانے کی کوشش کی۔ اسی وجہ سے ہم نے اپیل کی تھی کہ ایک ”عالمی اسلامی رفاہی ادارہ“ تشکیل دیا جائے جو پوری طاقت کے ساتھ بھوکوں کو غذائی اشیاء، ننگوں کو

لباس ' مریضوں کو دوائیں ' یتیموں اور بیواؤں کو سرپرستی ' الگ تھلگ پڑے ہوئے لوگوں کو ٹھکانا ' جاہلوں کو تعلیم ' بے روزگاروں کو روزگار اور مزدوروں کو تربیت فراہم کرے اور اندورنی طور ر مسلم معاشروں کی ترقی میں سنجیدہ کردار ادا کرے۔

ہم نے حسن البناء جیسے رہ نما کو دیکھا ہے کہ وہ اپنی دعوت و تحریک میں سماجی کام پر مثبت توجہ دیتے تھے ' اسے اپنے بنیادی مقاصد میں شمار کرتے تھے اور ہر شعبے میں سماجی کام کا شعبہ قائم کرتے تھے جس کا مقصد ہر سطح پر ضرورت مندوں کے ساتھ نیکی کرنا اور نیکی پر آمادہ کرنا ہوتا تھا۔

بعض اسلامی تحریکیں اور جماعتیں اپنے آپ پر لوگوں کی مدد اور ان کے ساتھ نیکی کو اس وقت تک کے لیے حرام کیے ہوئے ہیں جب تک متوقع اسلامی ریاست کا قیام عمل میں نہ آجائے۔ وہ بس مہدی منتظر کے انتظار میں لگی ہوئی ہیں جو کسی دن زمین یا آسمان سے نکل آئے گا اور ان لوگوں کا "مہدی منتظر" اسلامی حکومت یا ریاست ہے۔ وہ کسی قابل ذکر کام میں لگنے کے بجائے اس کے انتظار میں وقت گنوا رہی ہیں۔

ان میں سے ایک نے تو غلو سے کام لیتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ اسلامی ریاست کے بغیر کوئی جہاد نہیں۔ جب ریاست نہیں تو جہاد بھی نہیں دوسرے الفاظ میں جہاد امام کے جھنڈے کے نیچے ہی ممکن ہے اور کوئی امام ہے ہی نہیں۔

اسی طرح اسلامی ریاست کی عدم موجودگی میں بھلائی کے حکم اور برائی کی روک تھام (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) کا بھی کوئی جواز نہیں۔ اس طرح کے لوگوں کی طرف سے بس یہی کہنا باقی رہ گیا ہے کہ:

"جب تک ریاست قائم نہیں ہوجاتی تب تک نماز اور زکوۃ بھی واجب نہیں ہے۔"

کام کی ذمے داری سب پر ہے

یہ بھی ہماری مصیبتوں میں سے ہے کہ بے کار و بے عمل لوگوں کی کثرت ہے جو دوسروں کی طرف سے کام کیے جانے کے منتظر رہتے ہیں جب کہ یہ ہر ایک کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی صلاحیت اور طاقت و مقدور بھر کام کرے۔

فاتقوا اللہ ما استطعتم۔ (التغابن-۱۶)

"لہٰذا جہاں تک تمہارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو۔"

ہمیں یہ نہیں کرنا چاہیے کہ ہم اس کے انتظار میں بیٹھے رہیں کہ صرف حکام کام کریں، یا صرف علماء کام کریں، یا صرف دولت مند حضرات کام کریں یا صرف جاہ و منزلت والے کام کریں یا صرف تعلیم یافتہ لوگ کام کریں۔ ہمیں واقعی کامیابی اس دن ملے گی جب مسلم عوام کے جم غفیر کو اسلام کے لیے اور اسلامی طرز پر کام کرنے کے لیے متحرک بنا لے جائیں جیسے یہودیوں نے اپنی "ارض موعود" کے لیے ساری دنیا کے یہودیوں کو متحرک کر دیا تھا جب کہ وہ دنیا کے مختلف ممالک میں منتشر اور متعدد قوموں میں بکھرے ہوئے تھے۔

ہماری ذمے داری ہے کہ ہم تمام مسلمانوں کو متحرک کریں تاکہ ہر ایک اپنی صلاحیت و طاقت کے مطابق اپنا کردار ادا کرے، مرد اپنا کردار، عورت اپنا کردار، بوڑھے اور بچے اپنا کردار، مال دار اپنا کردار اور مفلس اپنا کردار۔ یعنی یہ کہ سبھی اپنا اپنا کردار انجام دیں اور ہر ایک کو اس کے لائق کردار سونپا جائے جو کسی راستے سے کوئی کانٹا بھی ہٹا سکتا ہو وہ یہی کام انجام دے ڈالے اور جو زمین میں کوئی بیج ڈال سکتا ہو وہ اس میں کوتاہی نہ کرے۔ جو ایک روپیہ دے سکتا ہو وہ دے ڈالے اور اسے کم اور حقیر نہ سمجھے۔ نہ منافق قسم کے مذاق اڑانے والوں کے مذاق کی پروا کرے:

الذین یلمزون المطوعین من المومنین فی الصدقٰت و الذین لا یجدون الا جھدھم فیسخرون منھم سخر اللہ منھم و لھم عذاب الیم (التوبہ-۷۹)

”(اللہ خوب جانتا ہے ان کنجوس دولت مندوں کو) جو برضا و رغبت دینے والے اہل ایمان کی مالی قربانیوں پر باتیں چھانٹتے ہیں اور ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جن کے پاس (راہ خدا میں دینے کے لیے) اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو وہ اپنے اوپر مشقت برداشت کر کے دیتے ہیں۔ اللہ ان مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے لیے دردناک سزا ہے“۔

کون جانتا ہے شاید ایک روپیہ ہی اللہ کے نزدیک میزان میں ایک ہزار بلکہ ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ وزن دار ثابت ہو۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”ایک درہم ایک لاکھ درہم پر سبقت لے گیا‘ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ وہ کیسے؟ آپؐ نے فرمایا: ایک شخص کے پاس بہت ساری دولت ہے اس نے اس کثیر دولت میں سے ایک لاکھ درہم صدقہ دیا۔ دوسرے شخص کے پاس صرف دو درہم ہیں اس نے انھیں میں سے ایک درہم صدقہ کر دیا تو اس (دوسرے) شخص نے اپنی آدھی دولت صدقہ کر دی۔“ (نسائی)

اسلام کسی نیک کام کی بے قدری نہیں کرتا‘ چاہے وہ مقدار‘ حجم اور تعداد کے اعتبار سے کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ وہ کہتا ہے کہ ایک ذرہ برابر بلکہ رائی کے ایک دانہ برابر بھی کوئی بھلائی کا کام اللہ کے نزدیک ضائع نہیں ہوتا۔ اہمیت صرف اس بات کی ہے کہ اس کام کا جذبہ اور نیت کیا ہے؟

اگر اس کے پیچھے نیک نیتی اور بلند مقصد ہے تو اللہ تعالیٰ اس کام کو خوشی کے ساتھ قبول کرتا ہے اور کام کرنے والے کو دہرا اجر دیتا ہے چاہے وہ کتنا ہی معمولی

کیوں نہ نظر آئے۔

یہی بات قرآن کریم کی آیات میں صاف صاف کہی گئی ہے:

ان اللہ لا یظلم مثقال ذرۃ و ان تک حسنتہ یضاعفھا و یوت من لد نہ اجرا عظیما۔ (النساء-۴۰)

"اللہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔ اگر کوئی نیکی کرے تو اللہ اسے دو چند کرتا ہے اور پھر اپنی طرف سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے۔"

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ۔ (الزلزال-۷)

"پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا"۔

و نضع الموازین القسط لیوم القیامتہ فلا تظلم نفس شیئا و ان کان مثقال حبتہ من خردل اتینابھا۔ و کفی بنا حاسبین - (الانبیاء-۴۷)

"قیامت کے روز ہم ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دیں گے پھر کسی شخص پر ذرہ برابر بھی ظلم نہ ہوگا جس کا رائی کے دانے کے برابر کچھ کیا دھرا ہوگا وہ ہم سامنے لے آئیں گے اور حساب لگانے کے لیے ہم کافی ہیں"۔

چوتھا باب

خاتمہ کلام

بات ختم کرنے سے پہلے ہم پھر اصل سوال کی طرف لوٹتے ہیں کہ خرابی کہاں ہے؟ اور جواب کو مختصر کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ خرابی عام اور ہمہ گیر ہے اور فرق مراتب کے ساتھ سبھی پر ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ یہ صرف اسلامی تحریکوں کی خرابی نہیں بلکہ پوری امت اسلامیہ کی ہے اور اگر ہم صاف طور پر سننا چاہیں تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ خرابی ہم سب کے اندر ہے۔ ہمارے پہلوؤں میں دھڑکتے ہوئے دلوں میں، اپنی اپنی ذات سے محبت میں، اپنی اپنی ذات کو بت بنا کر اس کے اردگرد چکر لگاتے رہنے میں، اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینے اور دوسروں پر الزام لگانے میں اور اپنے سوا ہر ایک کو ذمے دار ٹھہرانے میں۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے بھائی کی آنکھ کا تنکا تو دیکھ لیتا ہے لیکن خود اپنی آنکھ کا شہتیر اسے نظر نہیں آتا۔

جی ہاں! خرابی ہم سب میں ہے۔ ہر ایک چاہتا ہے کہ وہ خود آرام کرے اور باقی مسلمان کام کریں، وہ خود بیٹھا رہے اور باقی مسلمان جہاد کریں، وہ خود بخل سے کام لے اور باقی مسلمان خرچ کریں اور وہ خود تفریح کرے اور باقی مسلمان قربانیاں دیں۔

خرابی ہم سب میں ہے کہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں مگر اس کے حکم کی پیروی نہیں کرتے، اللہ کے رسولؐ سے محبت کرتے ہیں لیکن ان کے طریقے پر نہیں چلتے، جنت کے خواہاں ہیں لیکن اس کے لیے کوشش نہیں کرتے، جہنم سے ڈرتے ہیں لیکن اہل جہنم

کے راستوں پر چلتے ہیں اور اسلام سے انتساب پر فخر کرتے ہیں لیکن اس کی نصرت کے لیے سرگرم نہیں ہوتے۔

خوش خبری ہے اس شخص کے لیے جو اپنے آپ سے کام کا آغاز کرے پھر دوسروں کو دعوت دے اور جو بھی نیکوکار ہو اس کے ساتھ تعاون کرے۔ اپنے حال پر ماتم کناں اور اپنے مستقبل سے مایوس نہ ہو' اپنے آپ پر بھروسا کرے' اپنے دین پر فخر کرے' اپنے پروردگار پر پورا ایمان و یقین رکھے اور اس مدد کا امیدوار رہے جس کا وعدہ اللہ نے اہل ایمان سے کر رکھا ہے۔ خلیج چاہے جتنی وسیع ہو اس کا پاٹنا ممکن ہے۔ ہماری کامیابی میں امید کے اسباب نا امیدی و مایوسی کے محرکات و عوامل سے کہیں زیادہ بڑے ہیں۔

جن چیزوں سے مستقبل کے بارے میں امیدوں کو تقویت ملتی ہے وہ ہیں:

۱- ہمارے ساتھ وہ حق ہے جس کی بنیاد پر آسمان و زمین قائم ہیں جسے لے کر اللہ نے اپنے آخری نبیؐ کو مبعوث فرمایا اور اپنی آخری کتاب نازل کی جو فرد کے لیے ہدایت' خاندان کے لیے اطمینان و سکون' معاشرے کے لیے ہم آہنگی اور انسانیت کے لیے بھلائی کا ذریعہ ہے۔

۲- ہمارے ساتھ اسلام کی وہ فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور جس کی آغوش میں روزانہ ایک بڑی تعداد لوٹ کر آتی ہے اور گمراہی کے بعد ہدایت پاتی ہے' گناہ کے بعد توبہ کرتی ہے' فکر و طرز عمل میں انحراف کے بعد صحیح راستہ اختیار کرتی ہے' خواب و غفلت کے بعد بیدار ہوتی ہے اور اسلام کے قافلہ میں ضم ہونے والوں میں شامل ہوتی ہے۔

۳- ہمارے ساتھ امت اسلامیہ کی وہ قومیں ہیں جن کے گوشت پوست میں اسلام سرایت کیے ہوئے ہے اور جن کے ذہنی' نفسیاتی اور اجتماعی وجود کا جزو لاینفک بن چکا

ہے جو اسلام کے بغیر زندہ رہ سکتی ہیں نہ اپنا تشخص حاصل کر سکتی ہیں جن کے لیے اسلام سے بڑا کوئی محرک نہیں جو مشرق و مغرب سے درآمد کردہ تمام حل آزما چکی ہیں اور سوائے نامرادی کے ان کے ہاتھ کچھ نہیں لگ سکا اور جو صرف اسلام کو نجات دہندہ سمجھتی ہیں۔

۴- ہمارے ساتھ انسانی مصلحت و مفاد بھی ہے۔ انسانیت' زمینی قوانین اور انسانی فلسفوں کے ہاتھوں بدبختی کا شکار ہو چکی ہے۔ اسے آسمانی ہدایت کے علاوہ کوئی چیز خوش بخت نہیں بنا سکتی اور یہ آسمانی ہدایت صاف ستھری شکل میں صرف رسالت محمدی میں مل سکتی ہے جس کی کتاب کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ کر رکھا ہے اور جس میں کسی طرف سے باطل کی کوئی آمیزش نہیں ہو سکتی۔

۵- پھر ہر چیز سے پہلے اور سب سے آخری بات یہ ہے کہ ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت ہے جس کا وعدہ اس نے اپنی مدد کرنے والوں سے کر رکھا ہے اور یہ ضمانت دے رکھی ہے کہ وہ اپنے نور کو مکمل کرے گا اور اپنے دین کو غالب کرے گا چاہے مخالفین اسے کتنا ہی ناپسند کریں اور اس کی راہ میں کتنے ہی روڑے اٹکائیں:

یریدون ان یطفئوا نور اللہ بافواھھم و یابی اللہ الا ان یتم نورہ و لو کرہ الکافرون ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ و لو کرہ المشرکون (التوبہ-۳۲'۳۳)

"یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھادیں' مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کیے بغیر ماننے والا نہیں ہے' خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو' وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پوری جنس دین پر غالب کردے' خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔